ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

APRIL - 1989

اعلانِ داخلہ

مدرسہ مصباح العلوم چوکونیاں بھارت بھاری، بستی یوپی، شاخ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ، یو۔ پی

مصباح العلوم چوکونیاں ایک تعلیمی و تربیتی درسگاہ ہے جو دینی و عصری علوم پر مشتمل نصابِ تعلیم کے تحت رواں دواں ہے جس میں تیرہ مخلص و محنتی اساتذہ نیز چار دیگر کارکنان اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ بہت خوش آئند بات ہے کہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے مکمل تعلیمی و تربیتی کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ پرچے و ممتحن جامعہ سے آتے ہیں، کئی بار جامعہ کے اساتذہ جانچتے ہیں۔ اس طرح جامعہ نے اس کا الحاق کر کے اسے اپنی ایک شاخ قرار دے دیا ہے جس کے نتیجے میں تمام اصول و ضوابط جامعہ کے نافذ ہوتے ہیں۔ صدر جامعہ خود یا اپنا نمائندہ بھیج کر ہر سال تعلیمی، تربیتی و انتظامی معائنہ کرتے اور ہر شعبہ کے متعلق مفید مشورہ دیتے ہیں تاکہ یہ نوخیز ادارہ ترقی کے صحیح رخ پر گامزن ہو سکے۔ اب تک ہاسٹل میں ساٹھ طلبہ مقیم رہے جن کے خورد و نوش کا بہت معقول نظم ہے۔ مستطیع طلبہ سے ماہانہ خوراک حسب مصارف لی جاتی ہے البتہ نادار و غیر مستطیع طلبہ کو مدرسہ چند اخلاقی و تعلیمی شرائط کے ساتھ وظائف دیتا ہے۔ طلبہ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اتالیق حضرات بچوں کو اسلامی اخلاق و آداب اور دینی سیرت و کردار کا حامل بناتے ہیں تاکہ یہ مدرسہ ایک قابلِ اعتماد تربیت گاہ و درسگاہ بن سکے۔ اس طرح مدرسہ نے قلیل مدت میں اچھے معیاری تعلیم و بہتر تربیت کی بنا پر نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے لہٰذا آپ حضرات اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے مدرسہ کی خدمات حاصل کریں۔ درخواست ۲۵ رمضان تک آجانی ضروری ہے۔ مزید معلومات کے لئے قواعد و ضوابط اور داخلہ فارم طلب فرمائیں۔ داخلہ ۱۰ر شوال سے ۲۵ر شوال تک ہوگا۔

پتہ

صدر مدرسہ مصباح العلوم، چوکونیاں، بھارت بھاری، بستی، یوپی

شاخ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد ۳ ——— شمارہ ۴

اپریل ـ ۱۹۸۹ء

• مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

• مرتب ——— ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• سالانہ زرِ تعاون	۳۰ روپئے
• خصوصی تعاون	۱۰۰ روپئے
• غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
• فی شمارہ	۳ روپئے

ترسیلِ زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

فضل نعیمی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

ماہِ رمضان کا حقیقی استقبال	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳

بحث و نظر

دینی مدارس کی ہدایات اور نصاب کی خصوصیات	پروفیسر محمد سلیم	۹
والدین	صباح الدین ملک	۲۶
قدرت پر تق کا کیسا جنون ہے یہ؟!	ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی	۳۹

عظمت کے مینارے

حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ	ڈاکٹر عبد الرحمٰن رافت پاشا	۳۱
دورِ جدید کے مسائل اور ان کا حل	شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز۔ عبد الرزاق عفیفی۔ عبد اللہ بن قعود۔ عبد اللہ بن غدیان	۳۶

تعارف و تبصرہ

رسولِ کریمؐ اور یہود حجاز	نظام الدین فلاحی	۵۱

لیل و نہار

ابو داعی نشست	محمد اسمٰعیل فلاحی	۵۵
بہی خواہانِ جامعہ کی خدمت میں	دفتر نظامت	۶۳

ماہِ رمضان کا حقیقی استقبال

قوموں کا عروج و زوال اتفاقاتِ زمانہ کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی اٹل اور طے شدہ سنت کا ظہور ہوتا ہے۔ تاریخِ عالم کا مطالعہ اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو قوم خدائی ہدایت کا اتباع کرتی ہے وہ اوجِ ثریا پر فائز ہوتی ہے اور جو قوم اس سے روگردانی کرتی ہے ثریا سے تحت الثریٰ پر آ رہتی ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر پردۂ فنا میں غائب ہو جاتی ہے۔ خدائی ہدایت سے محروم کتنی ہی پُرشکوہ قومیں افسانۂ ماضی بن چکیں، ان کی تہذیب ان کے ساتھ دفن اور ان کا تمدن تباہ و برباد ہو گیا اور اگر ان میں سے کوئی باقی ہے تو وہ انسانیت کے لیے سامانِ عبرت و موعظت بن کر باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو کتابِ ہدایت سے نوازتا ہے تو گویا اس کے سر پر امامت و پیشوائی کا تاج رکھ دیتا ہے لیکن اگر وہ اس کی ہدایات کی پروا نہیں کرتی اور اس کی کتاب کے ساتھ کھیل کرتی ہے تو پھر وہ معاف نہیں کرتا اور اس کا معاملہ اس کے ساتھ بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کے خلاف فردِ قراردادِ جرم یہی ہے۔ انھوں نے کتابِ ہدایت کا حق ادا نہیں کیا۔ انھیں تورات کا حامل بنایا گیا تھا لیکن وہ اس امانت کا حق ادا نہیں کر سکے۔ مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفاراً۔ (ان لوگوں کا حال جن پر تورات کی ذمہ داری ڈالی گئی پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا، اس گدھے کا سا ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔)

تورات کے ساتھ ان کی بے وفائیوں اور سرد مہریوں کی ایک لمبی فہرست قرآن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بطورِ عذاب ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی اور وہ راندۂ درگاہ کر دیے گئے۔ ان سے امامت و پیشوائی کا تاج چھین لیا گیا اور ان کی جگہ ایک دوسری امت برپا

کی گئی۔ ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ نے اس کے سامنے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ رکھ دی کہ یہ تو خیر امت پھسلنے نہ پائے لیکن جن مقامات پر بنی اسرائیل کے قدم ڈگمگائے تھے اور جہاں جہاں انھیں ٹھوکر لگی تھی اس امت کے افراد نے بھی وہ سب کچھ دہرایا، وہیں ان کے قدم بھی پھسلے اور وہیں انھیں بھی ٹھوکر لگی۔

اس امت کی چودہ سو سالہ لمبی تاریخ ہے جو اس کے لئے داستان غیر نہیں، خود اپنی داستان اور اپنی حکایت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک اس امت نے اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے تھاما، شگفتہ تائید و نصرت اس کے شامل حال رہی لیکن جوں جوں اس کا رشتہ اس کتاب سے کمزور ہوتا گیا اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اس کے ساتھ بدلتا چلا گیا۔ قرآن کا کون سا حکم ہے جو ہم نے پامال نہیں کیا؟ قرآن کی کس ہدایت کو ہم نے پائے حقارت سے نہیں ٹھکرایا؟ کتاب الٰہی کے معاملے میں ہماری کوئی روش کیا ایسی بھی ہے جو بنی اسرائیل سے مختلف ہو؟ اس کتاب کے ساتھ اگر کبھی گستاخی کی گئی تو ہماری پیشانیوں پر بل آتا رہا، بھویں تنتی اور آستینیں چڑھتی رہیں لیکن دوسری جانب ہم نے خود اس کتاب کو الماریوں میں بند کر کے رکھ دیا، اس پر گرد کی تہیں جمتی رہیں۔ خواہشات سے میل نہ کھانے والے ہر حکم کو ہم نے دیوار پر دے مارا، ہمارے مفادات نے ہر اس ہدایت کو روند ڈالا جو ان سے ٹکرائی۔ یقیناً اسے ہم آنکھوں سے لگاتے، سینوں سے چمٹاتے اور چومتے رہے لیکن اپنی زندگی کی باگ اس کے ہاتھ میں دینے کو تیار نہیں ہوئے۔ کتاب سے عقیدت کے دعوے کرتے رہے لیکن ہماری زندگی کی گاڑی اس کے مخالف سمت چلتی رہی۔ اس کتاب کی شہادت دینے کے بجائے قول و عمل سے الٹی شہادت دیتے رہے۔

بنی اسرائیل نے کتاب الٰہی کے ساتھ ایک جرم کیا تھا، اس کا انجام ان کے سامنے آیا۔ ہم نے بھی وہی جرم دہرایا تو کیا وجہ ہے کہ ہم اس انجام سے دوچار نہ ہوں اور ہمارے ساتھ برعکس معاملہ ہو۔ آج مسلمانوں پر جو بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور وہ جن مسائل میں گرفتار ہیں، کیا کتاب الٰہی (قرآن) کی ناقدری کے علاوہ کسی اور چیز کا نتیجہ ہیں اور کیا اسے خدا کے عذاب کے سوا کسی اور چیز کا نام دیا جا سکتا ہے؟

رمضان میں قرآن نازل ہوا اور اس میں روزے فرض ہوئے تاکہ تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ (...... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تم پر روزہ فرض کیا گیا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو)۔ کیونکہ تقویٰ کے بغیر ہم قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتے۔ (ھدًی للمتقین یہ کتاب خدا ترس لوگوں کے لئے ہدایت ہے)۔ قرآن ایک کتاب ہدایت ہے اور اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر صحیح معنوں میں تقویٰ پایا جاتا ہو۔ تقویٰ صرف بھوک پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں ہے، زندگی بھر خدا کی نافرمانی سے بچنا، اس کے منع کردہ کاموں سے رک جانا اور اس کے پسند کے کام کرنا تقویٰ ہے۔ تقویٰ کا مسکن و مقام دل ہے، تقویٰ دل کو گھر بناتا ہے، دل میں کیا جذبات ہیں، اس کی کیا کیفیات ہیں، اس میں خدا کی مرضی کا کتنا پاس و لحاظ ہے، اصل دیکھنے اور غور کرنے کی چیز یہی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کتنے روزہ دار ہیں جن کے پلے بھوک پیاس کے سوا کچھ اور نہیں پڑتا اور کتنے تراویح پڑھنے والے ہیں جن کو جاگنے کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ (کم من صائم لیس له من صیامه الا الظماء وکم من قائم لیس له من قیامه الا السهر) اور جو جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔ (من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه وشرابه)

قرآن میں ہے: ورتل القرآن ترتیلا۔ قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف پڑھو۔ حدیث میں بار بار آپؐ کا ارشاد ہماری نظروں سے گزرتا ہے: "اعربوا القرآن" قرآن کو صاف صاف ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح قرآن پڑھا کرتے کہ ہر حرف صاف صاف ادا ہوتا اور ہر آیت پر وقف فرماتے، خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے۔ ایک ایک لفظ کا اثر لیتے، جنت کا تذکرہ ہوتا تو آپ کے اشتیاق کی کیفیت نظر آتی، دوزخ پر کلام ہوتا اس کا ہول طاری ہو جاتا اور اس سے پناہ مانگنے لگتے۔

قرآن کی اسی طرح تلاوت ہدایت کے نقطۂ نظر سے مفید ہو سکتی ہے۔ بے سوچے سمجھے پڑھ لینے سے یقیناً ثواب مل جائے گا لیکن قرآن کا مقصد نزول ہدایت حاصل کرنا ہے، برکت

دراصل زندگی کے لئے ہدایت نامہ ہے۔ اگر یہ نہ معلوم ہو کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں یا یہ کتاب ہم سے کیا مطالبہ کر رہی ہے تو ہدایت کیسے مل سکتی ہے؟ "تلاوت کے معنی عربی زبان میں صرف الفاظ پڑھنے کے نہیں آتے بلکہ قرآن کے الفاظ پڑھنے، معنی سمجھنے اور عمل کرنے کا نام تلاوت ہے، لیکن ماتم کیجیے کہ امت کی اکثریت صرف الفاظ پڑھ لینے پر مطمئن ہو گئی ہے۔" [1]

عام طور پر اس ماہ میں ختم قرآن کا اہتمام مسجدوں میں کیا جاتا ہے۔ حفاظ کرام تراویح میں اس طرح قرآن پڑھتے ہیں کہ مقتدیوں کو جو سورتیں یاد ہوتی ہیں انھیں بھی وہ سمجھ نہیں پاتے کہ کیا پڑھا جا رہا ہے، اور اگر کوئی حافظ ٹھہر ٹھہر کر صاف پڑھنا چاہے بھی تو مقتدی چلنے نہیں دیتے۔ ان کو خواہش ہوتی ہے کہ اگر ایک حافظ بارہ منٹ میں ایک پارہ پڑھتا ہے تو کوئی ایسا حافظ لائیں کہ دس ہی منٹ میں ختم کر دے۔ رکوع، سجود، قومہ، جلسہ، قعدہ وغیرہ کا جو حال ہوتا ہے کسے نہیں معلوم؟

اس طرح قرآن پڑھنا کیا "ورتل القرآن ترتیلا" (اور قرآن کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کرو) اور حضورؐ کے ارشاد "ورتلوا القرآن" (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر صاف پڑھو) اور حضورؐ کے عمل کی خلاف ورزی، نماز کے ساتھ کھیل اور قرآن کے ساتھ مذاق نہیں ہے؟

بلاشبہ بہت سی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں اس جانب خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ جہاں جلد از جلد قرآن ختم کرنے سے زیادہ قرآن ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف صحیح طریقے سے پڑھنے کا اہتمام ہوتا ہے اور جو کچھ پڑھا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یا تلخیص بھی پیش کی جاتی ہے۔

اس مہینے میں قرآن کے طلبہ و اساتذہ اور علمائے کرام کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے۔ انھیں اپنے اپنے علاقوں میں قرآن و حدیث کے حلقہائے درس قائم کرنے اور قرآن سمجھنے سمجھانے کی عام فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن کائنات کے خالق و مالک کا کلام ہے۔ زبردست خدا کی زبردست کتاب ہے۔ یہ کتاب عزت دینے، رفعت و بلندی سے ہمکنار کرنے اور غلبہ و اقتدار کے تاج و تخت عطا کرنے آئی ہے۔

---

[1] مفید بیانات، از جلیل احسن ندوی ص ۴۹۶

اس کو فرقان کہا گیا ہے۔ فرقان کے معنی ہیں حق و باطل کو الگ کر دینے والی۔ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دینے والی اور اہل حق و اہل باطل کے مابین امتیاز کرنے والی۔ اس کتاب کی ایک دوسری صفت عزیز آئی ہے۔ یہ کتاب "عزیز" ہے۔ عزیز وہ ہوتا ہے جس کو کوئی زیر نہ کر سکے، جس کو کوئی دبا نہ سکے، جس پر کوئی اثر انداز نہ ہو سکے، جس کے آگے سب سرنگوں ہوں۔ یہ کتاب عزیز ہے، زبردست ہے، غلبہ و اقتدار، عزت و سربلندی اس کتاب کا خاصہ ہے۔ باطل اس کے آگے ٹک ہی نہیں سکتا۔ "کتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ" (یہ کتاب عزیز ہے، باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے)

اس کتاب کو نہ ماننے والے، اس کی مخالفت کرنے والے اور اس کے ساتھ کھیل کرنے والے اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے اور اپنی ہی ذلت و نامرادی میں اضافہ کرتے ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین۔ (بلاشبہ اللہ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کو سربلند اور اسی کے ذریعہ (کتاب سے اعراض اور خلاف ورزی کے نتیجے میں) کچھ دوسروں کو پست بھی کرتا ہے) یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کتاب کے حاملین مغلوبیت و محکومی سے دوچار ہوں لیکن اگر امر واقعی یہ ہے کہ ہم پر ذلت اور نامرادی کے تازیانے مسلسل برس رہے ہیں تو غور و فکر کا مقام ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا حال ان لوگوں کا سا ہو گیا ہو جن کے بارے میں کہا گیا تھا: مثل الذین حملوا التوراۃ ..... یحمل اسفارا۔ (ان لوگوں کا حال جن پر تورات کی ذمہ داری ڈالی گئی پھر انھوں نے اسے نہ اٹھایا، اس گدھے کا سا ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو)

یہ ماہ صیام، ماہ مبارک ہر سال آتا ہے، اس سال بھی آ رہا ہے۔ کتنی سعید اور مبارک ہیں وہ روحیں جو فضول گپوں اور لایعنی کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرتی، لذت کام و دہن کا سامان کرنے کے بجائے قرآن کی تلاوت کرنے اسے سمجھنے سمجھانے اور عمل کرنے کرانے کے لئے بے چین رہتی اور راتوں کو نرم گداز بستروں پر خراٹے لینے کے بجائے گرم گرم آنسوؤں سے مصلوں کو بھگوتی اور تڑپتے دل اور بے چین

روح کے ساتھ اپنے آقا ومولیٰ سے راز ونیاز اور دعا ومناجات کرنے میں مصروف رہتی ہیں اور جن کی زبان، جن کی نگاہ، جن کے اشارے اور جن کے عمل سے لوگ محظوظ رہتے ہیں۔
لیکن آہ! کس طرح ہم آج اس معزز مہمان، رمضان، کا استقبال کرتے ہیں؟

ہمیں افسوس ہے اور ہم معذرت خواہ ہیں کہ پریس والوں کی مہربانیوں کی وجہ سے مارچ ۱۹۸۹ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں بروقت نہیں پہنچا سکے تھے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی کرم فرمائیوں کا یہی حال رہا تو اپریل ۱۹۸۹ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں کب پہنچے گا۔ مگر

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

●●

بقیہ: دینی مدارس کی روایات اور ......

بعض فاضل اساتذہ کو جدید مغربی علوم سے ناواقفیت کا احساس ہوا۔ اس کے لئے فوراً "رسالۃ الحمیدیہ" کو شامل نصاب کیا ہے۔ یہ کتاب طرابلس الغرب (لیبیا) کے ایک فاضل عالم حسین بن محمد بن مصطفیٰ الجسر (۱۳۰۷ھ) کی تصنیف ہے۔ (ملخصاً المحصلین ص ۳۰۲) اس میں شریعت کی حکمتیں اور مغربی فلسفہ کے بعض حقائق سادہ انداز میں تذکرہ ہے۔ اسی غرض کے لئے دارالعلوم کورنگی کراچی کے بانی مفتی محمد شفیع مرحوم نے مغربی علوم اور فلسفہ کے ماہر دانشور پروفیسر حسن عسکری سے مغربی افکار سے تعارف حاصل کرنے کے لئے ایک کتاب "جدیدیت" کے نام سے لکھوائی جس کو نصاب میں شامل کر لیا گیا تھا۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے تاریخی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک نمو پذیر نصاب تعلیم ہے۔ اس پر جمود کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے۔ البتہ اس کی نمو پذیری آزادانہ ہے۔ اس کو درخت کی نمو درد نمو پذیری سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جب بھی کسی معروف عالم دین نے حالات کے تقاضوں کا احساس کیا اور پھر ضروری مضمون کا نصاب میں اضافہ کیا تو عموماً دوسرے اہل علم نے اس اضافہ کو قبول کر لیا۔ اس کو مستحسن قرار دیا۔ اسی طرح آہستہ روی کے ساتھ یہ نصاب ترقی کرتا رہا ہے۔ صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد دینی مدارس کے نصاب نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

دینی مدارس کی روایات
اور
نصاب کی خصوصیات

[illegible]

معاشرہ میں وہ ادارے زندہ رہتے ہیں جو کوئی خدمت انجام دیتے ہیں، اور جو ادارے معاشرہ کی خدمت انجام نہیں دیتے وہ وقت کی رفتار کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ دینی تعلیم کا ادارہ ڈیڑھ ہزار سال سے مسلمان معاشرہ کی تعلیمی اور دینی خدمات انجام دے رہا ہے اس لئے آج بھی زندہ اور برقرار ہے۔ مغرب کی استعماری قوتوں کے غلبہ کے بعد اس پر نکبت وادبار کے بادل چھا گئے مگر سخت جان ادارہ یہ صدمے بھی سہہ گیا۔ اب کہیں قدرے حالات تبدیل ہوئے ہیں۔ ایسے سازگار حالات میں اس امر کی توقع بے جا تھی کہ اس نظام تعلیم کا کوئی سنجیدہ مطالعہ پیش کیا جاتا۔ ان مدارس پر جو کچھ لکھا گیا وہ سرسری انداز میں لکھا گیا۔ ذیل میں ایک مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے گرچہ یہ بھی مختصر ہے:

اسلام کی تعلیمی تحریک

مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آزاد فضا میسر آئی۔ مدینہ آکر آپ نے سب سے پہلے مسجد تعمیر کی۔ مسجد کے ایک جانب چبوترا (صفہ) درسگاہ کے لئے مخصوص کیا جس پر کچھ باہر سے آمدہ نومسلم چند روز کے لئے قیام کرتے تھے اور دین کا علم حاصل کرتے تھے۔ صفہ کا مدرسہ اسلام کا پہلا مدرسہ تھا۔ اس مدرسہ کے قیام سے تعلیم وتدریس کا تعلق مسجد سے قائم ہو گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں مساجد تعمیر ہوتی رہیں وہاں مدارس بھی قائم ہوتے رہے۔ مدینہ منورہ کے اندر ہی آپ کی حیات مبارکہ میں نو مدرسے قائم ہو چکے تھے۔ ہر مسجد مدرسہ ہوتی تھی۔ اس لئے بڑے بڑے مدرسے قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

سب سے پہلے تو آپ نے مسلمانوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیبات سنائیں۔ علم کی اہمیت ان کے دل میں بٹھائی ان کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ آپ نے قرآن کی آیت پڑھ کر سنائی:

"کیا علم جاننے والا اور نہ جاننے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔" (زمر: ۹)

آپؐ نے فرمایا: "ایک عالم کو ایک عابد پر اتنی ہی فضیلت حاصل ہے جتنی کہ چودھویں رات کے چاند کو ستاروں پر حاصل ہوتی ہے۔"

آپؐ نے فرمایا کہ علم حاصل کرنا بذات خود مطلوب ہے، علم کی تحصیل کسی دوسرے مقصد کے لئے نہیں ہونی چاہئے۔ علم کا مقصد نوکری کرنا یا مادی فائدے حاصل کرنا نہیں ہے، علم کا طلب کرنا اسلام کے نزدیک کار عبادت ہے۔ درس و تدریس میں مشغول استاد اور شاگرد کار عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ درس و تدریس میں بھی اسی قدر ثواب ملتا ہے جتنا کہ عبادت میں ملتا ہے۔ نماز عبادت ہے، جس وقت بھی کسی مسلمان کو توفیق ملے وہ نماز ادا کر سکتا ہے، نماز کے لئے نہ جگہ کی شرط ہے نہ عمر کی شرط ہے۔ اسی طرح تحصیل علم کے لئے نہ جگہ کی شرط ہے نہ عمر کی شرط ہے جس عمر میں بھی جاہل مسلمان کو غفلت سے تنبیہ حاصل ہو جائے وہ تحصیل علم شروع کر سکتا ہے۔ جس طرح مسلمان معاشرہ کا کام ہے کہ وہ بستی میں مسجدیں تعمیر کرے تاکہ مسلمان جماعت کے ساتھ نماز ادا کر سکیں، اسی طرح یہ بھی مسلمان معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ مدرسے قائم کرے، حصول تعلیم کے لئے سہولتیں فراہم کرے تاکہ مسلمان علم دین حاصل کر سکیں۔ مسجد میں نماز پڑھنے والے سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ اسی طرح مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے والے سے کوئی فیس نہیں لی جا سکتی۔ معاشرہ کا اور مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ حصول علم کی راہ سے تمام مشکلات اور رکاوٹیں دور کر دے۔

تعلیم و تدریس کے دو ستون ہیں، طالب علم اور استاد۔

طالب علم کے اندر جذبہ اور شوق پیدا کرنے کے لئے آپؐ نے فرمایا:

"علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

"تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جس نے قرآن مجید سیکھا اور پھر دوسروں کو سکھایا۔"

"جس دل میں قرآن مجید کا ذرا سا حصہ بھی نہیں وہ ایک ویران گھر کی مانند ہے۔"

ان احادیث نے طالب علم کو تحصیل علم پر ابھارا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ طالب علم کو باور کرایا کہ تحصیل علم طالب علم کی ضرورت ہے۔ تحصیل علم طالب علم کی ذمہ داری ہے۔ یہ طالب علم کو زیب ہے کہ وہ علم حاصل کرے، جہاں سے چاہے حاصل کرے، جس طرح چاہے حاصل کرے،

اپنے شہر کے عالموں سے استفادہ کرے یا کسی دوسرے شہر میں جائے، یہ تمام امور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل کام علم حاصل کرنا ہے اور یہ طالب علم کی ذمہ داری ہے۔ طالب علم کے متعلق آپؐ نے مسلم معاشرہ کو ہدایت کی:

استوصوا بهم خيرا۔ — تم ان لوگوں کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرو۔

اس لئے طلبہ کے لئے مدارس قائم کرنا، معلم و مدرس فراہم کرنا، قیام و طعام اور ضروری مصارف مہیا کرنا یہ تمام مسلمان معاشرہ اور مسلمان حکومت کا کام ہے۔ محلہ محلہ بستی بستی مدرسے قائم کرنا چاہئیں۔

تعلیم کا دوسرا ستون استاد ہے۔ استاد کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خیر کی تعلیم دینے والے استاد کے حق میں زمین کی ہر شے مغفرت کی دعا کرتی ہے۔"

"لوگوں کو علم پہنچاؤ خواہ تمہیں ایک ہی آیت معلوم ہو۔"

ان ترغیبات کے ساتھ ساتھ آپؐ نے استاد کو وعید بھی سنائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"جس کسی سے علم کی بات دریافت کی گئی جسے وہ جانتا ہے اور پھر وہ نہ بتائے تو قیامت کے دن ایسے شخص کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔" (ترمذی)

استاد کے لئے بھی اصل حکم یہی ہے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دے۔ یہاں بھی معاوضہ اور سہولتوں کا مسئلہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان رسالتؐ سے نکلے ہوئے یہ وہ ارشادات ہیں جن کی بنا پر ہر پڑھا لکھا شخص استاد ہوتا تھا اور تعلیم دیتا تھا۔ علماء کے تذکروں میں جہاں یہ بات درج ملتی ہے کہ فلاں فلاں ان کے استاد تھے وہاں ساتھ ہی یہ بات بھی درج ملتی ہے کہ فلاں فلاں ان کے شاگرد تھے۔ ان احکام کی بنا پر ہر شخص تعلیم دیتا تھا خواہ وہ کوئی باقاعدہ مدرسہ قائم کرے یا نہ کرے حتیٰ کہ سرکاری ملازمین بھی فارغ اوقات میں طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ آخرت میں وہ عدم تدریس کی وعید کے تحت پکڑ لئے جائیں۔ یہ اساتذہ جہاں علوم میں ماہر ہوتے تھے وہاں تقویٰ اور خدا ترسی میں بھی نمایاں ہوتے تھے۔ وہ اپنے طلبہ کے اندر صرف علمیت ہی نہیں پیدا کرتے تھے بلکہ ان کے اندر تقویٰ اور طہارت بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات نے ایک عمومی اور خودکار تحریک تعلیم جاری

فراہم کی تھی۔ استاد کو ترغیب دی کہ وہ پڑھائے اور طالب علم کو ترغیب دی کہ وہ پڑھے۔ تعلیم کے لئے کسی ساز و سامان اور تنظیم کی ضرورت نہیں تھی جس کا جی چاہے مسجد میں آ کر یا مسجد کے باہر تعلیم کا آغاز کر سکتا تھا۔ یہ تعلیمی تحریک مسجد نبوی مدینہ منورہ سے شروع ہوئی۔ سارے عرب میں پھیل گئی اور تینوں بر اعظموں میں پھیل گئی۔ ڈیڑھ ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی وہ تحریک بہر کیف جاری ہے۔

مدارس کا پھیلاؤ

عام طور پر اہل علم شہر کی بڑی مسجد میں حلقۂ درس قائم کرتے تھے جس کے اندر علم ہوتا تھا اور صلاحیت ہوتی تھی۔ اس کا درس مقبول ہو جاتا تھا، اس کا حلقہ وسعت اختیار کر لیتا تھا ورنہ سکڑ کر ختم ہو جاتا تھا۔ مکتب میں قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد اور ابتدائی نوشت و خواند سیکھنے کے بعد ہر طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان حلقوں کا رخ کرتا تھا۔ یہاں کوئی مقرر نصاب نہیں ہوتا تھا۔ ابتدا میں ساری تعلیم زبانی ہوتی تھی۔ مسجد و مدارس میں مختلف علوم کے حلقے بیک وقت سرگرم عمل رہتے تھے۔ مفسرین، محدثین، فقہاء، قراء، متکلمین، نحوی، شعراء، واعظین، اپنے حلقے جدا بنائے ہوئے تھے۔

طالب علم آزاد ہوتا تھا جس حلقہ میں چاہے شرکت کرے، جتنا عرصہ چاہے شرکت کرے اور پھر کسی دوسرے حلقے میں شرکت کرے۔ یہ سب طالب علم کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا کہ کن کن علوم کی تحصیل کرے۔ بعض دفعہ ایک طالب علم مختلف استادوں کے حلقہ میں شرکت کرتا تھا جو شہر کی مختلف مساجد میں درس دیتے تھے اس لئے طلبہ مختلف مساجد کے درمیان دوڑ لگاتے رہتے تھے۔ امام احمدؒ بن حنبل کا قول ہے:

"اگر کوئی شخص بغداد کی گلیوں میں دوڑتا نظر آئے تو سمجھو یا تو وہ کوئی طالب علم ہے یا پھر کوئی پاگل شخص ہے۔"

اس دوڑ دھوپ کے باوجود زیادہ سے زیادہ ۴-۵ درسوں میں شرکت کر پاتے تھے جبکہ دوپہر کا کھانا بھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ قاضی ابو یوسف، امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں ۱۷ سال تک شریک ہوتے رہے۔

پہلی صدی ہجری گزرنے کے بعد بعض مدرسے آج کل کے معیار کے لحاظ سے بین الاقوامی جامعات بن گئے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ) کی درس گاہ کوفہ میں ایک مرتبہ طالب علموں کو

شہروں کے طلبا سے گھر گیا تھا۔ عالم اسلام کے پچاس شہروں کے طلبہ وہاں موجود تھے اور امام مالک (۱۷۹ھ) کی درس گاہ مسجد نبوی میں ۵۵ شہروں کے طلبہ موجود تھے۔

چار صدیوں تک درس و تدریس کا مرکز مسجد ہی میں رہا۔ سلاجقہ عظام کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے نظام تعلیم کو بہتر اور برتر بنانے کے لئے مساجد کے باہر مدارس کا سلسلہ شروع کیا۔ موصوف نے سب سے پہلے مدرسہ نظامیہ بغداد ۴۵۷ھ میں تعمیر کیا۔ اس کے بعد نیشاپور، بلخ، اصفہان، ہرات اور بصرہ میں نظامیہ مدارس قائم ہوئے۔ ان مدارس میں طلبہ اور اساتذہ کی رہائش، خوراک اور آسائش کا معقول انتظام ہوتا تھا۔ کتابیں اور کاپیاں، تدریسی سامان مہیا ہوتا تھا۔ مصارف پورے کرنے کے لئے نظام الملک نے مختلف شہروں میں اوقاف قائم کر دیئے تھے جہاں سے اساتذہ کو مشاہرے اور طلبہ کو وظائف ملتے تھے۔ یہ سب خارجی معاملات تھے ورنہ داخلی طور پر اساتذہ بدستور آزاد تھے۔ استادوں کے عزل و نصب، نصاب کتب، سند وغیرہ میں استاد آزاد تھے البتہ مدارس میں رہائش کے لئے طلبہ کے لئے بعض قواعد و ضوابط کی پابندی ضروری تھی۔

چونکہ اساتذہ نے مساجد سے نکل کر ایک نظم میں رہنا قبول کر لیا تھا، بیش قدر مشاہرات قبول کر لئے تھے اس لئے ان امور پر اس دور کے علماء نے احتجاج کیا تھا۔ علماء ماوراء النہر نے ایک جلسہ طلب کیا تھا جس میں ان اقدامات کی مذمت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طریقہ سے تعلیم و تدریس میں خلوص و للہیت ختم ہو گئی، اب یہ ایک کاروبار بن گیا۔

مگر بتدریج یہی طریقہ کار سارے عالم اسلام میں مقبول ہو گیا۔ مولانا حالیؔ نے مدارس کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ انھوں نے عالم اسلام کے مختلف اہم مدارس کا یکجا ذکر کر دیا ہے ؎

نظامیہ، نوریہ، مستنصریہ — نفیسیہ، ستیہ اور صاحبیہ
رواحیہ، عزیہ اور قاہریہ — عزیزیہ، زنجیبیہ اور ناصریہ
یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے
حجازی و کردی و قبچاقیوں کے
عراقین و شامات و خوارزم و توراں — جہاں جنس تعلیم بکتے تھے ارزاں
وہیں پہ بسر کر کے کوہ و بیاباں — پہنچتے تھے طلاب افغان و ایراں

جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا
ہر اک راہ میں ان کا آنا بڑھا تھا

ایل خانی عہد میں غازان محمود (۱۳۰۴ء-۱۲۷۱ء) نے مسلمان ہو کر اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا۔ رفاہی ادارے قائم کئے۔ دارالسلطنت تبریز میں مدارس، خانقاہیں، رصدگاہ تعمیر کرائی۔ اس کے جانشین الجائتو خدابندہ (۱۳۱۷ء-۱۳۰۴ء) کے متعلق تو بیان کیا گیا ہے کہ ایک مدرسہ اس کے ساتھ سفر کرتا رہتا تھا۔ ہر پڑاؤ پر مدرسہ کا خیمہ بھی ایستادہ کیا جاتا تھا۔ (حبیب امیر۔ ص ۱۱۲)

علوم و فنون اور تعلیم و تدریس کو تیموریوں کے زمانہ میں (۹۱۱-۸۰۵ھ) ایران، خراسان اور ترکستان میں فروغ حاصل ہوا۔ تیمور (۸۰۵ھ) کے قائم کردہ مدرسہ سمرقند میں دو نہایت فاضل علماء مدرس تھے۔ ملا سعدالدین تفتازانی اور میر شریف جرجانی (۸۱۶ھ) ان کے علم و فضل کا دور دور چرچا تھا۔ ان کی علمیت کا سکہ آج تک دینی مدارس میں قائم ہے۔ دوسرا اہم مدرسہ سلطانیہ تھا جو سلطان حسین بایقرا (۹۱۱-۸۷۳) اور اس کے فاضل وزیر میر علی شیر نوائی نے قائم کیا تھا اس میں بھی بڑے علماء اور مدرس شامل تھے۔ اسی میں مولانا عبدالرحمٰن جامی بھی مدرس رہے تھے اس میں ۱۰ ہزار طلبہ مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ (بہارستان از جامی)۔ خراسان و سمرقند اس دور میں اسلامی علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز بن گئے تھے جس کی تعریف مولانا عبدالرحمٰن جامی اس طرح فرماتے ہیں:

سکہ کہ در یثرب و بطحیٰ زدند   نوبت آخر بہ بخارا زدند

خاندان غلاماں (۱۲۹۰-۱۲۰۶ء) کے دور حکومت میں برصغیر ہند و پاکستان صحیح معنوں میں عالم اسلام کا حصہ بنا۔ تعلیم و تدریس کا اسلامی نظام یہاں رائج ہوا۔ یہاں بھی سلاطین نوابین اور امراء مدارس قائم کرتے تھے اور اوقاف قائم کرتے تھے۔ یہاں بھی مدارس کا اندرونی نظم و نسق اساتذہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ حکمران اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان و پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبات بلکہ بعض گاؤں میں بھی مدارس قائم تھے۔

سلطان محمود غزنوی نے نظام الملک طوسی سے قبل ۴۱۰ھ میں غزنی کے اندر ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کیا تھا۔ فاتح ہندوستان سلطان معزالدین محمد بن سام غوری نے اُچ بہاولپور میں

مدرسہ معزیہ قائم کیا تھا جس کے صدر مدرس قاضی منہاج الدین سراج تھے۔ سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان فیروز شاہ نے دہلی میں مدرسہ فیروزی قائم کیا تھا۔ اُچ سے آ کر قاضی منہاج سراج یہاں صدر مدرس بن گئے۔ سلطان محمد تغلق نے خرم آباد دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں محمد ادریس (۷۴۲ھ) صدر مدرس تھے یہ بڑے شیریں زبان خطیب تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے نہایت وسیع اور عالیشان مدرسہ قائم کیا تھا جو آج بھی مدرسہ حوض خاص کے نام سے مشہور ہے جس میں سید محمد یوسف بخاری صدر مدرس تھے۔ ملک کے اطراف میں بھی بڑے بڑے مدارس قائم تھے۔ حیدرآباد دکن میں محمود گاواں نے مدرسہ کے لئے عالیشان عمارت تعمیر کرائی تھی جو آج بھی موجود ہے۔

ہندوستان و پاکستان میں مدارس کی تعداد کا اندازہ سیاحوں کی تحریرات سے ہوتا ہے۔ قلقشندی مصری نے لکھا ہے کہ محمد شاہ تغلق کے دور میں دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے جن میں ایک مدرسہ شوافع کا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں انگریز سیاح ہملٹن نے ٹھٹھہ سندھ کا دورہ کیا تھا وہ لکھتا ہے کہ یہاں چار سو مدرسے قائم ہیں۔ ان بیانات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں کتنی کثیر تعداد مدارس قائم تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی ذوق و شوق کا تذکرہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے (۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) ماثر الکرام فی آثار البلگرام میں اس طرح لکھا ہے:

"طلبہ علم کے شوق میں گروہ در گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر گھومتے پھرتے تھے۔ جہاں کہیں حالات سازگاری اختیار کر لیتے تھے وہاں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے تھے"۔

"امراء اور اصحاب خیر کی حویلیاں اور ڈیوڑھیاں ان طلبہ کے لئے قیام گاہیں ہیں جہاں ان کو تمام ضروریات زندگی مفت مہیا کی جاتی ہیں"۔

"ہر بستی کے صاحب توفیق افراد طالب علموں کا خیال رکھتے ہیں اور ان کی خدمت کرنے کو بڑی سعادت تصور کرتے ہیں"۔

ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت قائم ہو گئی تب ان مدارس پر مصائب اور مشکلات نازل ہوئیں۔ ۱۸۲۸ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے تمام اوقاف اور معافیاں بحق سرکار ضبط کر لیں۔ مدارس کی آمدنی کے سوتے خشک ہو گئے۔ مدارس خود بخود مرجھا گئے۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے حکم نافذ کیا۔ عربی و فارسی کے تعلیم یافتہ شخص کو سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی۔

اس حکم نے ہفت صد سالہ اسلامی نظام تعلیم کی بساط الٹ دی۔ ان مدارس کی اب کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔ یہ مٹتے چلے گئے۔

عربی نصاب تعلیم کا ارتقاء

اسلامی احکام کے مطابق دینی علوم کی تحصیل کرنا فرض عین ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی علوم کو حاصل کرے۔ اور دنیوی علوم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ معاشرہ میں کم از کم چند افراد کو یہ علوم ضرور سیکھنے چاہئیں۔ دینی مدارس کی اصطلاح میں پہلے حصّہ کو منقول اور دوسرے حصّہ کو معقول کہتے ہیں۔ منقول کا حصّہ ناقابل تغیر ہے اور معقول کا حصّہ قابل تغیر ہے۔ منقول اور معقول دونوں اجزاء سے مل کر اسلام کا تدریسی نصاب مکمل ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید، حدیث اور فقہ سیکھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ تعلیم کا دینی حصّہ ہے۔ آپؐ نے علم فرائض (حساب) طب، نجوم اور علم انساب سیکھنے کا بھی حکم دیا ہے۔ آپؐ نے عام حکم دیا ہے۔ حکمت کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں کہیں ملے اسے حاصل کرے۔ آپؐ کے حکم کی تعمیل میں حضرت زید بن ثابتؓ انصاری نے فارسی، سریانی اور حبشی زبانیں سیکھی تھیں۔ یہ سب تعلیم کا دنیوی حصّہ تھا۔ آپؐ نے ورزش، تیراکی اور تیر اندازی سیکھنے کا حکم بھی دیا تھا۔ یہ جسمانی تعلیم کا حصّہ تھا۔

احکام رسالتؐ کی روشنی میں حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں تعلیم کا ڈھانچہ تیار کیا، چھوٹے بچوں کے لیے مسجدوں میں مکاتب جاری فرمائے، ان میں اوقات تدریس صبح اور شام مقرر فرمائے، اساتذہ کا تعین کیا، اعلیٰ تعلیم کے لیے مساجد میں حلقے قائم کئے، بزرگ صحابہ کو حکم دیا کہ وہ مساجد میں اپنے حلقے قائم کریں تاکہ عوام مسلمان وہاں علم حاصل کریں۔ جسمانی تعلیم کا بھی آپؓ نے خاص خیال رکھا۔

فتوحات کی کثرت کے زمانہ میں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ مسلمان مفتوح اقوام کے طور طریقے نہ اختیار کرلیں۔ اور عیش و عشرت کی زندگی میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لئے حضرت عمرؓ نے مملکت میں ایک عمومی حکم نامہ جاری کیا اور مسلمانوں کو سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا، کافروں کی تقلید سے منع کیا۔

"مسلمانو! چادر اوڑھو، تہبند باندھو، شلوار[1] استعمال کرو، جوتے پہنو، چرمی موزے اتار دو، تیراندازی کی مشق کرو، گھوڑے کی زین میں رکابیں استعمال نہ کرو، لڑکوں کو تیراکی سکھاؤ، گھوڑے کی پیٹھ پر اچھل کر بیٹھو، دھوپ کھایا کرو، عربوں کا حمام یہ ہے۔ عربی زبان میں بات چیت کرو، اپنے دادا معد بن عدنان کی سی سادہ زندگی بسر کرو، موٹا کھاؤ، موٹا پہنو، مشقت اور جفاکشی کی عادت ڈالو، عیش و تنعم کی زندگی سے بچو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ریشم کے کپڑے استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

اسلام کے بعد سے طلبہ اور استادوں نے سادہ زندگی اختیار کر لی، محنت اور جفاکشی کو اپنا شعار بنا لیا، کافروں کی نقالی سے پرہیز کیا۔ موٹا کھانے اور موٹا پہننے پر قناعت کی۔ آج تک مدارس کی روش یہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی درسگاہ میں مختلف مضامین کا درس دیتے تھے، قرآن مجید، احادیث نبویؐ، فقہی مسائل، مغازی رسولؐ (اسلامی تاریخ) ایام العرب (عربی تاریخ) اور عرب کی شاعری۔ ہر ایک کے لئے انھوں نے الگ الگ دن مقرر کر رکھا تھا۔ وہ دینی اور دنیوی مختلف علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت امام شافعیؒ دینی علوم کے ساتھ ریاضی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اور تیر اندازی میں بھی ماہر تھے۔

اس زمانہ تک نصاب تعلیم میں صرف کتاب اللہ قرآن مجید شامل تھی۔ باقاعدہ تعلیم صرف قرآن مجید کی ہوتی تھی۔ تجوید، تلاوت، تفسیر، احکام مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۱۰۱ – ۹۹ھ) نے دیار و امصار کے علماء کو احادیث رسولؐ مرتب اور مدون کرنے کا حکم دیا اس کے بعد سے احادیث رسولؐ کا درس شروع ہوا اور احادیث رسولؐ نصاب تعلیم کا باقاعدہ حصّہ بن گئیں۔ ہر شخص قرآن مجید کے ساتھ احادیث رسولؐ کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ تدوین حدیث کے سلسلے میں مسلمان علماء نے جو غیر معمولی محنتیں کی ہیں اور جس طرح اس فن شریف کی خدمت کی ہے وہ ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔

---

[1] شلوار اور چرمی موزے ایرانی استعمال کرتے تھے جو اس وقت تک غیر مسلم تھے۔

فقہ کی تعلیم جاری تو عہد صحابہ میں ہی ہو چکی تھی لیکن عہد بنی امیہ کے آخری دور میں اس فن کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ امام ابو حنیفہؒ (۸۰–۱۵۰ھ) نے اس فن کو باقاعدہ مرتب و مدون کیا پھر انہی کے نمونہ پر مالکی اور شافعی فقہ بھی مرتب ہوئی اور فقہ کی تدریس نصاب تعلیم کا لازمی جزو بن گئی۔

بنی امیہ کے دور میں خارجیوں کا فرقہ بڑا طاقتور تھا اور ان کا اثر بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی دور میں عقائد کی بحثیں بہت عام تھیں۔ اس دور میں امام ابو حنیفہ نے صحیح عقائد پر ایک مختصر رسالہ "فقہ اکبر" لکھا۔ اس کا انداز تحریر غمازی کرتا ہے کہ یہ تدریسی ضروریات کے لئے لکھا گیا ہے مگر درحقیقت عقائد کی تعلیم (علم کلام) کی باقاعدہ تدریس تیسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ یونانی فلسفہ کے زیر اثر اس دور میں مناظرہ بازی عام تھی۔ ابو الحسن علی اشعری (۲۶۰ھ) نے ان مناظروں میں معتزلہ کو شکست دی۔ امام ابو الحسن اشعری اور امام منصور ماتریدی (۳۳۳ھ) کی ان کوششوں کو علمائے وقت نے بہ نظر استحسان دیکھا ان مباحث کو پسند کیا اس وقت سے عقائد اور علم کلام کی بحثیں بھی نصاب تعلیم کا جزو بن گئیں۔

اس کے بعد کوئی ملک ہو، کوئی زمانہ ہو، دینی علوم کے تحت قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد کی تعلیم نصاب تعلیم میں لازماً شامل رہی ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں معتزلہ، فلاسفہ اور قرامطہ کا عروج تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں انتشار اور اختلال پھیل رہا تھا۔ نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے تھے۔ نظام الملک طوسی نے (۱۰۹۲ء) انہی فتنوں کا سدباب کرنے کے لئے سلاجقہ عظام کی وسیع سلطنت میں نظامیہ مدارس کا جال پھیلا دیا تھا۔ ان فتنوں کی بنیاد یونانی فلسفہ پر تھی جس کا آغاز مامون الرشید کے زمانہ سے ہوا تھا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۵۸–۱۱۱۱ء) جب مدرسہ نظامیہ بغداد کے شیخ مقرر ہوئے تو انھوں نے اس مشکل مسئلہ کی جانب توجہ دی۔ پہلے انھوں نے یونانی فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا اور پھر اس کا بھرپور رد کیا۔ مستقل بنیادوں پر فلسفہ کی تردید کے لئے انھوں نے فلسفہ کے تعارف کو اور پھر اس کی تردید کو نصاب تعلیم کا جزو بنا دینا مناسب خیال کیا۔ علمائے وقت نے ان کے اس اقدام کی تحسین کی۔ سب نے اس اضافہ کو قبول کر لیا۔

اس طرح یونانی فلسفہ کی تعلیم قدیم نصاب تعلیم کا جزو بن گئی۔

تاتاری منگولوں کے ہاتھوں بغداد کا سقوط (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) بہت بڑا سانحہ تھا یہ ایک تہذیب اور تمدن کے دور کا خاتمہ تھا۔ مہینوں قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ ہزارہا علماء، فضلاء اور اساتذہ قتل کر دیئے گئے۔ سینکڑوں کتب خانے جلا دیئے گئے یا دریا میں بہا دیئے گئے، مدارس ویران ہو گئے، علم و فضل کی بساط الٹ دی گئی۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ہلاکو خان کے وزیر اعظم نصیر الدین محقق طوسی (۱۲۷۳ء) نے علم کی بساط کو دوبارہ جمانے کی کوشش کی۔ ہلاکو خان کے حکم سے اس نے ایک نیا نصاب تعلیم ترتیب دیا۔ کافر تاتاریوں کے ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے فلسفہ، ریاضی اور علم نجوم کی خاصی مقدار نصاب تعلیم میں شامل کر دی۔[1] یہ نصاب ملک میں رائج ہو گیا۔ اس دور میں ہی درسی کتابوں کا رواج ہوا۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق سبق درس کا استعمال سب سے پہلے صدر الشریعہ عبید اللہ بخاری (۷۴۷ھ) کی کتاب شرح وقایہ کے دیباچہ میں ملتا ہے۔[2]

عہد تیموریہ کے دو نامور اساتذہ علامہ سعد الدین تفتازانی (۷۹۳ھ) اور میر سید شریف جرجانی (۱۴۱۳ء/۸۱۶ھ) نے اس نصاب پر بھرپور نظر ثانی کی۔ اس میں چند اصلاحات داخل کیں اور نصاب کی تشکیل جدید کی۔ انھوں نے پہلی مرتبہ تدریس کے لئے کتابیں لکھیں۔ یہ نصاب پھر ہندوستان اور پاکستان میں رائج ہوا۔ ان کی لکھی ہوئی صرف میر اور نحو میر آج تک مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان حکمران ترک تھے اور وسط ایشیاء، ماوراء النہر سے یہاں آئے تھے۔ بخارا اور سمرقند کے علماء کی کتابیں لا کر انھوں نے یہاں نصاب میں شامل کر دیں۔ ہدایہ کے مصنف برہان الدین مرغینانی، صنائع بدائع کے مصنف کاسانی (قازان، روس) اور فتاویٰ کے مصنف قاضی فخر الدین فرغانی سب اس علاقہ کے لوگ تھے۔ فقہ کی یہ کتابیں انھوں نے یہاں رائج کر دیں۔

---

[1] اسلام اور عصر رواں۔ ص ۲۶، از ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔ [2] کتاب محمد خیام

مغل دورِ حکومت میں ایرانی علماء کا ایک سیلاب ہندوستان میں آ گیا۔ انھوں نے یونانی فلسفہ کو ہندوستان میں رائج کیا اور خوب فروغ دیا۔ یہ حالات تھے جب ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۷۴۸ء) نے لکھنؤ میں نصابِ تعلیم کی تشکیلِ جدید کی۔ انھوں نے نہ تو کسی مضمون کا اضافہ کیا اور نہ کسی نئی کتاب کا اضافہ کیا بلکہ جو کتابیں مختلف مدارس میں پڑھائی جاری تھیں ان کو نئی ترتیب دی۔ ان کی ترتیب یعنی درسِ نظامی مقبول ہوا اور ان کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ملا نظام الدین بحیثیت مدرس اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو گئے تھے۔ ان کے معاصر مشہور مؤرخ غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء) لکھتے ہیں:

"آج ہندوستان کے اکثر علماء ملا صاحب سے تلمذ رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ جو شخص یا سلسلۂ تلمذ ان تک پہنچا دیتا ہے وہ اپنے ہمعصروں میں امتیاز حاصل کر لیتا ہے اگرچہ اس نے تحصیلِ علم دوسری جگہ کی ہو مگر سندِ فراغ وہ" ملا نظام الدین سے حاصل کرنا پسند کرتا ہے۔

دو صدیاں سے زیادہ عرصہ ہو گیا دینی مدارس میں یہی نصابِ تعلیم رائج ہے۔ مسلمانوں کے تمام فرقے اسی نصاب کو پڑھاتے ہیں۔ جو شخص یہ نصاب نہ پڑھے وہ مستند عالم شمار نہیں ہوتا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳ء-۱۷۶۳ء) نے محسوس کیا کہ اس نصاب میں حدیث کا حصہ کم ہے۔ انھوں نے اس نصابِ تعلیم میں حدیث کی چند مستند کتابیں شامل کر دیں۔ اس وقت سے درسِ نظامیہ میں دورۂ حدیث جاری ہو گیا۔ اس وقت سے اس ملک میں حدیث کا غلغلہ عام ہوا ہے۔

انگریزی کمپنی نے دو مدرسے قائم کیے، مدرسہ عالیہ کلکتہ (۱۷۸۱ء) اور دہلی کالج (۱۷۹۲ء) مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نصابِ تعلیم میں پہلی مرتبہ تاریخ میں ابو الفداء اور سیوطی کی کتابوں کا اضافہ کیا گیا اور عربی ادب میں نفحۃ الیمن (۱۸۱۲ء) از شیخ احمد شیروانی یمنی کا اضافہ ہوا۔ دہلی کالج میں ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۴۰ء میں دیوانِ حماسہ اور دیوانِ متنبی کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر لائٹ نر نے اورینٹل کالج لاہور کے نصاب میں یہ اضافے قبول کر لیے۔ ان اضافوں کو علماء نے بھی بنظرِ تحسین دیکھا اور بتدریج تمام دینی مدارس میں یہ اضافے قبول کر لیے گئے۔ اسی طرح آج کل بعض دینی مدارس میں وان ڈیک کی کتاب محیط الدائرہ پڑھائی جاتی ہے۔ یہ امریکن بیروت کالج کے استاد فان ڈیک مرحوم VAN DYKE (۱۸۱۸ء-1895) کی تصنیف ہے جس کو مدارس نے قبول کر لیا ہے۔

باقی صفحہ ۹ پر

حضرت اُسَید بن حُضَیر رضی اللہ عنہ

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا۔ ترجمانی: ابو جاوید

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ سے تاریخِ اسلامی کی اولین دعوتی سفارت پر یثرب پہنچے اور قبیلۂ خزرج کے ایک رئیس حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ انھوں نے ان کے مکان کو اپنی قیام گاہ، دعوتِ اسلامی کی نشر گاہ اور نبوتِ محمدیؐ کے اعلان و اظہار کا مرکز قرار دیا۔ باشندگانِ یثرب بڑے پیمانے پر اس نوجوان داعی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مجلسوں کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کی شیریں گفتاری، ان کے پرزور استدلال، ان کی نرم طبعی اور ان کے چہرے سے پھوٹنے والے ملکوتی حسن میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ لوگ بڑی تعداد میں ان کی مجالس میں شریک ہونے کے لیے پروانہ وار کھنچے چلے آتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی تھی جو ان لوگوں کے لیے باعثِ کشش تھی، اور وہ تھی اللہ کی عظیم کتاب جس کی آیات کی تلاوت جب وہ اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز اور دلکش و شیریں لہجے میں کرتے تھے تو سخت سے سخت دل موم ہو جاتے اور آنکھوں سے بے تحاشا اشکوں کا سیلاب رواں ہو جاتا اور ان کی ہر مجلس میں کچھ نہ کچھ لوگ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیتے تھے۔

ایک دن اسعد بن زرارہؓ اپنے مہمان، داعیٔ اسلام حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ساتھ قبیلۂ بنی عبدالاشہل کے کچھ لوگوں سے ملاقات کرنے اور ان کو اسلام کی دعوت سے روشناس کرانے کے ارادے سے نکلے۔ وہ دونوں بنو عبدالاشہل کے ایک باغ میں گئے اور کھجوروں کے سائے میں ایک کنوئیں کے پاس بیٹھ گئے اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کے گرد کچھ مسلمان اور بعض دوسرے لوگ جو اُن کی زبان سے قرآنِ کریم کی آیات اور اسلام کی دعوت سننا چاہتے تھے، جمع ہو گئے۔ وہ انھیں اسلام کی دعوت سمجھا رہے تھے اور اس کے اجر و ثواب کی خوشخبری

سنا رہے تھے اور لوگ ان کی گفتگو کے حسن سے مسحور، خاموش و ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ اسی دوران ایک شخص قبیلہ اوس کے سرداروں، اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ کے پاس پہنچا اور ان کو بتایا کہ مکے سے آیا ہوا داعی ان کے مکان کے قریب ہی ٹھہرا ہوا ہے اور یہ جرأت اس کو اسعد بن زرارہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ یہ اطلاع پا کر سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا:

"اسید! اس مکی نوجوان کے پاس جاؤ جو یہاں آکر ہمارے کمزوروں کو بہکاتا ہے اور ہمارے معبودوں کو سفاہت و حماقت کی طرف منسوب کرنے میں مصروف ہے۔ اس سے ڈانٹ کر کہہ دو کہ خبردار آئندہ وہ ہمارے قبیلے میں قدم نہ رکھے......" تھوڑی دیر رک کر انہوں نے پھر کہا:

"اگر وہ میرے خالہ زاد بھائی اسعد بن زرارہ کا مہمان اور اس کی پناہ میں نہ ہوتا تو میں خود ہی اس سے نمٹ لیتا۔ تم کو زحمت نہ دیتا۔"

اسید اپنا نیزہ اٹھا کر باغ کی طرف روانہ ہوا۔ جب حضرت اسعد بن زرارہ نے اس کو آتے ہوئے دیکھا تو مصعب بن عمیر سے بولے:

"مصعب! یہ اپنے قبیلہ کا سردار، ان میں سب سے زیادہ حلیم و بردبار اور صاحب فضل و کمال شخص "اسید بن حضیر" ہے۔ اگر یہ شخص اسلام قبول کرے تو اس کی اقتدا میں بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ خدا کے دین کی دعوت اس کے سامنے پورے خلوص و دلسوزی اور سلیقے سے پیش کرنا۔"

اسید بن حضیر اُن لوگوں کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے حضرت مصعبؓ اور ان کے دوست کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا:

"تم دونوں کو ہمارے محلے میں آنے اور ہمارے کمزور لوگوں کو گمراہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

حضرت مصعب نے اسید کی طرف چہرہ اٹھایا جو ایمان کے نور سے جگمگا رہا تھا اور بڑے پرخلوص و دلکش لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے سردار! کیا آپ پسند کریں گے کہ میں آپ کے سامنے اس سے بھی اچھی بات پیش کروں؟"

"وہ کون سی بات ہے؟" اسید نے پوچھا۔

"آپ اطمینان سے یہاں تشریف رکھیں اور غور سے ہماری باتیں سنیں۔ اگر پسند آئیں تو انھیں قبول کر لیجیے گا اور ناپسند ہوں تو ہم یہاں سے واپس چلے جائیں گے اور پھر کبھی پریشان نہیں کریں گے۔" حضرت مصعب نے فرمایا۔

"تم نے انصاف کی بات کہی۔" یہ کہتے ہوئے اسید اپنا نیزہ زمین پر گاڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ پھر جب حضرت مصعب نے اسے اسلام کی حقیقت سمجھائی اور قرآن کریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں دور ہو گئیں، خوشی سے چہرہ چمک اٹھا اور وہ بولا:

"کتنی عمدہ ہیں یہ باتیں جو تم بتا رہے ہو اور کتنا جلیل القدر ہے یہ کلام جس کی تم تلاوت کر رہے ہو...... جب تم لوگ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟"

"اس کے لئے آپ غسل کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کر کے اس بات کا اقرار اور اعلان کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، پھر دو رکعت نماز پڑھئے۔"

اُسید اٹھ کر کنویں پر گئے، انھوں نے اس کے پانی سے طہارت حاصل کی اور اس بات کی گواہی دی کہ خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور پھر انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی اور اس طرح اس وقت عرب کا ایک قابل رشک شہسوار اور قبیلہ اوس کا ایک مشہور سردار لشکر اسلام میں شامل ہو گیا۔ عقل و دانائی میں ان کی برتری اور حسب و نسب میں ان کے فضل و شرف کی وجہ سے ان کے قبیلے نے ان کو "کامل" کے لقب سے نوازا تھا۔ وہ سیف و قلم دونوں کے دھنی تھے۔ وہ شہسواری اور تیر اندازی میں کامل دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے میں قرأت و کتابت کے وصف سے متصف تھے جس میں ایسے افراد نہایت کمیاب تھے جو پڑھنا لکھنا جانتے ہوں۔ ان کا قبولِ اسلام سعد بن معاذ کے قبولِ اسلام کا سبب بنا اور ان دونوں کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا قبیلۂ اوس کی ایک بڑی تعداد کے مشرف بہ اسلام ہونے، مدینہ کے رسول اللہ کے لئے دارِ ہجرت اسلام کی پناہ گاہ اور اس کی عظیم سلطنت کا پایۂ تخت بننے کا ذریعہ بن گیا۔

حضرت اسید نے جب سے حضرت مصعب بن عمیر سے قرآن سنا تھا، وہ اسی طرح اس کے گرویدہ ہو گئے تھے جیسے کوئی محب اپنے محبوب پر فریفتہ ہوتا ہے اور وہ اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے تھے جیسے کوئی پیاسا سخت گرمی کے دن میں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے گھاٹ کی طرف لپکتا ہے۔ انھوں نے قرآن عظیم کی تلاوت کو اپنا شب و روز کا مشغلہ بنا لیا تھا۔ وہ یا تو خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے نظر آتے یا تنہائی میں کتاب الٰہی کی تلاوت میں مشغول دکھائی دیتے تھے۔

ان کی آواز بڑی پُرسوز، ان کا لہجہ نہایت واضح اور ان کی ادائیگی بہت صاف تھی۔ عام طور سے قرآن کی تلاوت ان کو اس وقت بہت بھلی معلوم ہوتی تھی جب رات پُرسکون ہوتی، ماحول پر مکمل اور گہرا سناٹا طاری ہوتا، لوگ سو چکے ہوتے اور دلوں میں تکدر نہ ہوتا اور صحابۂ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ حضرت اسید کی تلاوت کے اوقات کے منتظر رہتے اور ان کی تلاوت کو سننے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شخص خود کو بڑا خوش قسمت تصور کرتا جس کو ان سے قرآن سننے کا موقع مل جاتا، جیسا کہ وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ ان کی تلاوتِ قرآن کی شیرینی و حلاوت سے آسمان والے بھی اسی طرح محظوظ ہوتے تھے جس طرح زمین والے اس سے لذت اندوز ہوتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت اسید آدھی رات کو اپنے مکان کے پچھواڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے صاحبزادے یحییٰ ان کی بغل میں سو رہے تھے اور ان کا گھوڑا، جس کو انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے پال رکھا تھا، ان سے کچھ فاصلے پر بندھا ہوا تھا۔ رات خاموش اور تاریک تھی، آسمان صاف و شفاف اور خوبصورت تھا اور ستاروں کی بیدار نگاہیں پُرسکون زمین کو رقت و لطافت کے ساتھ تک رہی تھیں۔ حضرت اُسید کے جی میں آیا کہ وہ اس خوشناک فضا کو قرآن کی خوشبو سے معطر کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دلکش آواز میں تلاوت شروع کی۔

الم۔ ذالك الكتاب لاريب	الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی
فيه۔ هدى للمتقين الذين يؤمنون	شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے

بالغيب ويقيمون الصلوة ومما	جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں،
رزقناهم ينفقون۔ والذين	جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ
يؤمنون بما انزل اليك وما	کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی
انزل من قبلك، وبالاخرة	قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئیں
هم يوقنون۔ (البقرۃ: ۱-۴)	ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا گھوڑا اس طرح اچھل کود رہا ہے جیسے وہ اپنی رسی توڑ لے گا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی گھوڑا بھی پُرسکون ہو گیا۔ پھر جب انھوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا:

اولئك على هدى من ربهم واولئك هم المفلحون۔

تو گھوڑا پہلے سے زیادہ اچھل کود کرنے لگا۔ وہ پھر خاموش ہو گئے۔ گھوڑا پھر پُرسکون ہو گیا۔ حضرت اسید نے وقفے وقفے سے تلاوت کا عمل کئی بار دُہرایا۔ وہ جب بھی تلاوت شروع کرتے گھوڑا بھڑکنے اور بدکنے لگتا اور جب وہ رک جاتے تو گھوڑا بھی پُرسکون ہو جاتا۔ انھیں اپنے بیٹے یحییٰ کے متعلق یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں گھوڑا اسے کچل نہ دے۔ اس لئے وہ اس کو جگانے کے لئے اس کے پاس گئے۔ یکایک ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان پر بادلوں کی چھتری سی تنی ہوئی ہے۔ وہ ایسا خوبصورت اور دلکش منظر تھا جو اس سے پہلے کبھی ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان بادلوں کے ساتھ چراغوں کی طرح کی کچھ روشنیاں معلق ہیں جن کی روشنی سے پوری فضا منور ہو رہی ہے۔ روشنی کی وہ قندیلیں نیچے سے اوپر کی طرف چڑھ رہی ہیں یہاں تک کہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ صبح کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر جب انھوں نے رات کا واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا:

"اے اسید! وہ فرشتے تھے جو تمہاری تلاوت سننے کے لئے آئے تھے۔ اگر تم نے اپنی قرأت کا سلسلہ منقطع نہ کیا ہوتا تو لوگ انھیں کھلم کھلا دیکھ لیتے۔"

جس طرح حضرت اسید کو کتاب الٰہی سے غیر معمولی عشق تھا اسی طرح انھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی بے انتہا محبت تھی، چنانچہ ان کا بیان ہے: "دو اوقات ایسے ہیں

بھی۔ سب سے اہم ان کی صفائی اور خوش الحانی تھی جس کی تعریف کی جاتی ہے۔ جب وہ قرآن پڑھتے گفتار میں بھی، وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش دیکھتے، گفتگو کرتے دیکھ رہے ہوں۔

ان کے دل میں ہمیشہ یہ تمنا اور خواہش رہتی تھی کہ ان کا جسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے مس ہو جائے اور وہ جھک کر آپ کے جسد مبارک کا بوسہ لیں۔ حسن اتفاق سے ایک بار ان کو یہ موقع نصیب ہو گیا۔ ایک دن حضرت اسید لوگوں کو اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی سے محظوظ کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو کر اپنے ہاتھ کی لکڑی ان کی کوکھ میں ہلکے سے چبھو دی۔ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ تو آپ نے کہا کہ اسید! تم مجھ سے اس کا بدلہ لے لو۔ حضرت اسید نے کہا کہ آپ کے جسم پر اس وقت قمیص ہے اور جب آپ نے میرے جسم میں لکڑی چبھوئی تھی تب میرے بدن پر کپڑا نہیں تھا۔ یہ سن کر آپ نے جسم سے کپڑا اٹھا دیا اور حضرت اسید بیتاب ہو کر جسم مبارک سے چمٹ گئے اور آپ کی بغل اور کمر کے درمیانی حصۂ جسم کو چومنے لگے۔

"اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، یہ میری ایک آرزو تھی جسے میں اپنے دل میں اس وقت سے پال رہا تھا جب سے آپ سے متعارف ہوا تھا۔ آج میری وہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت اسید کی محبت کا جواب محبت سے دیتے تھے اور ان کی سبقت اسلام کا بہت زیادہ خیال کرتے تھے۔ نیز اس بات کا بھی آپ بہت خیال کرتے تھے کہ انھوں نے غزوۂ احد میں اپنی جان پر کھیل کر آپ کا دفاع کیا یہاں تک کہ اس روز ان کے نیزے کے سات جان لیوا زخم آئے تھے۔ حضرت اسید کو اپنے قبیلہ میں جو قدر و منزلت حاصل تھی اس کا بھی آپ کو پورا پورا احساس تھا اسی لئے جب وہ کسی کی سفارش کرتے تو آپ ان کی سفارش ضرور قبول فرماتے تھے۔ حضرت اسید کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انصار کے ایک گھر کا ذکر کیا جو نہایت محتاج و ضرورت مند تھا اور اس میں اکثریت عورتوں کی تھی۔ تو رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

"اسید، تم میرے پاس اس وقت آئے ہو جب میں وہ سارا مال تقسیم کر چکا ہوں جو میرے

ہاتھ میں تھا، اب جب تم سننا کہ میرے پاس مال آیا ہے تو ان لوگوں کا مجھ سے ذکر کرنا۔"

اس کے کچھ دنوں کے بعد جب آپ کے پاس خیبر سے مال آیا تو آپ نے اسے مسلمانوں میں تقسیم فرمایا اور خاص طور سے انصار کو اور اس گھر والوں کو کافی مقدار میں مال دیا تو میں نے کہا:

"اے اللہ کے نبی! اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی طرف سے بہترین جزا دے تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"انصار کے لوگو! اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو بہترین جزا دے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں تم لوگ صبر و قناعت اختیار کرنے والے لوگ ہو۔ میرے بعد تم لوگوں کے حقوق نظر انداز کیے جائیں اور دوسروں کو تمہارے اوپر ترجیح دی جائے گی۔ جب ایسا ہو تو تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے ملاقات ہو۔ ہماری ملاقات حوض پر ہوگی۔"

حضرت اسید کہتے ہیں کہ جب خلافت کی ذمہ داری حضرت عمر بن خطابؓ کے حوالے ہوئی تو انھوں نے ایک دن مسلمانوں میں مال اور سامان تقسیم کیا اور میرے پاس ایک معمولی سا جوڑا بھیجا اور اس اثناء میں کہ میں مسجد میں تھا۔ میری طرف سے ایک قریشی جوان کا گزر ہوا جس کے جسم پر انہی جوڑوں میں سے ایک لمبا چوڑا جوڑا تھا جسے وہ زمین پر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے ایک ساتھی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا ذکر کیا اور اس آدمی نے حضرت عمر کے پاس جا کر میری بات ان کو بتا دی۔ وہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں اس وقت نماز میں مشغول تھا۔ انھوں نے کہا: اسید! نماز پڑھ لو۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے جو کچھ کہا اور دیکھا اس کو گوش گزار کر دیا تو انھوں نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے۔ وہ جوڑا میں نے فلاں کے پاس بھیجا تھا، وہ ایک انصاری ہیں جن کو بیعت عقبہ، غزوۂ بدر اور جنگ احد میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ ان سے وہ جوڑا اس قریشی نوجوان نے خرید کر پہنا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس بات کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو دی تھی وہ میرے زمانے میں پیش آئے گی؟" تو حضرت اسید نے کہا:

"امیرالمومنین! خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ وہ بات آپ کے زمانے میں نہیں پیش آئے گی۔"

حضرت اسید بن حضیرؓ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت ہی میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔ انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے ذمے چار ہزار درہم قرض ہے۔ ان کے ورثا نے چاہا کہ قرض کی ادائیگی کے لئے ان کی زمین کو فروخت کر دیں لیکن جب حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا میں اپنے بھائی اسید کے اہل و عیال کو تہی دست اور لوگوں کے لئے بار نہیں بننے دوں گا۔

پھر انھوں نے قرض خواہوں سے گفتگو کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان کی زمین کی پیداوار چار سال تک ایک ہزار درہم سالانہ کے حساب سے خرید لیا کریں اور اس طرح اپنا قرض وصول کر لیں۔ ••

بقیہ: دورِ جدید کے مسائل......

خرابی آتی ہے اور گھر کا بڑا اپنے خاندان کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔ نبیؐ کا ارشاد ہے:

"الرجل راع فی بیتہ وھو مسئول عن رعیتہ" آدمی اپنے گھر کا نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت (افرادِ خانہ) کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

س ۱۱۰ ۔ ص ۱۰۱

س: ان عورتوں کے سلسلے میں کیا حکم ہے جو اس طرح کے اخبارات و رسائل کو پڑھتی رہتی ہیں؟

ج: ہر مکلف شخص پر خواہ وہ عورت ہو یا مرد، بدعت و ضلالت سے پُر کتابوں اور ان رسالوں کو پڑھنا حرام ہے جیسے سرد یا اور من گھڑت باتیں پھیلاتے، جھوٹے پروپیگنڈے کرتے اور اخلاق فاضلہ سے انحراف کی دعوت دیتے ہیں۔ ہاں وہ شخص انھیں پڑھ سکتا ہے جو ان کے افکار و انحراف کا جواب دیتا اور ان سے متعلق لوگوں کو، ستھرات، درست باتوں کی تلقین اور ان کے عمل پر نظر رکھتا اور لوگوں کو ان کے شر سے ہوشیار و باخبر کرتا ہو۔

دوسری اور آخری قسط

وَهٰذا عِيدُنا

صباح الدین ملک

روزہ و عید شہادت کی بنیاد پر

اب تک جو بات سامنے آئی وہ یہ کہ رمضان و عید کا انعقاد عام رؤیت سے ہوگا۔ البتہ مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے رؤیت نہ ہو پائے تو مہینہ تیس کا قرار دے دیا جائے گا لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ چاند عام لوگ نہ دیکھ پائیں صرف دو چار آدمی ہی کو دکھائی دے اور وہ اس کی شہادت بھی دیں، تو ایسی صورت میں شریعت نے جو احکام دیئے ہیں انھیں تین نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ شہادت کی ضرورت مطلع صاف نہ ہونے پر پیش آتی ہے جب کہ عام لوگ چاند نہ دیکھ سکے ہوں، ورنہ ایک آدمی یا چند آدمی کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی خواہ وہ کیسے ہی متقی اور پرہیزگار ہوں۔

مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں رمضان کے چاند کے لئے ایک ثقہ مسلمان مرد یا عورت کی شہادت بھی کافی ہے۔ البتہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں جم غفیر یعنی بڑی جماعت کی شہادت ضروری ہوگی۔

اگر مطلع صاف نہ ہو یعنی بادل یا غبار یا دھواں وغیرہ افق پر اس طرح چھایا ہوا ہو جو چاند کو چھپا دے تو رمضان کے علاوہ دیگر مہینوں کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کافی ہے بشرطیکہ شاہد کے اوصاف ان میں موجود ہوں یعنی مسلم، عاقل، بالغ، بینا اور عادل ہو اور مجلس قضا میں خود حاضر ہو کر خود چاند دیکھنے کی شہادت دے۔

اس مسئلہ کی حدیثیں ملاحظہ فرمائیں۔

رمضان کے لئے:

۱۔ عن ابن عباس قال جاء اعرابی

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ کی

النبی فقال انی رأیت الهلال یعنی هلال رمضان فقال اتشهد ان لا اله الا الله قال نعم قال اتشهد ان محمدا رسول الله قال نعم قال یا بلال اذن فی الناس ان یصوموا غدا۔ (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، دارمی)

خدمت میں ایک بدو نے آکر عرض کیا: میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کہ تم اللہ اور محمدؐ پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تب آپؐ نے حضرت بلال سے فرمایا: کل روزہ کا اعلان کر دو۔

۲- عن عکرمة انهم شکّوا فی هلال رمضان مرة فارادوا ان لا یقوموا ولا یصوموا فجاء اعرابی من الحرة فشهد انه رأی الهلال فاتی به النبی فقال اتشهد ان لا اله الا الله وانی رسول الله قال نعم وشهد انه رأی الهلال فامر بلالا فنادی فی الناس ان یقوموا وان یصوموا۔ (ابو داؤد)

لوگوں نے ایک بار رمضان کے چاند میں شک کیا۔ ان کا قصد ہوا کہ نہ تراویح پڑھیں نہ روزہ رکھیں۔ پھر ایک اعرابی حرہ (مدینہ کے پاس ایک میدان) سے آیا اور اس نے چاند دیکھنے کی گواہی دی تو وہ رسول اللہؐ کے پاس لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ بولا: ہاں۔ اور اس نے گواہی دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے بلال کو حکم دیا کہ لوگوں میں پکار دیں: تراویح پڑھو اور روزہ رکھو۔

۳- عن ابن عمر قال تراءی الناس الهلال فاخبرت رسول الله انی رأیته فصام وامر الناس بصیامه۔ (ابو داؤد، دارمی، حاکم، ابن حبان)

عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی (مگر کسی کو نظر نہ آیا) میں نے چاند دیکھ لیا تو نبیؐ کو بتایا کہ مجھے چاند نظر آگیا۔ تو آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

عید کے لئے

۱- عن عبد الرحمن بن زید بن الخطاب ان رسول الله قال صوموا لرؤیته

عبد الرحمٰن بن زید خطاب سے روایت ہے کہ مجھے بہت سے صحابہ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ

وافطروا لرؤیته وانسکوا لها فان غم علیکم فاکملوا ثلاثین فان شهد شاهدان فصوموا وافطروا۔ (نسائی، احمد)

نبیؐ نے فرمایا تم چاند دیکھ کر روزے شروع کرو اور چاند دیکھ کر روزے ختم کرو اور اسی سے حج یا قربانی وغیرہ کے اوقات مقرر کرو۔ اگر بادل ہوں تو تیس دن کی گنتی پوری کرو لیکن اگر دو مسلمان رویت کی شہادت دیں تو روزے شروع کرو اور روزے ختم کرو۔

۲- عن الحسین بن الحارث الجدلی ان امیر مکة الحارث بن حاطب خطب ثم قال عهد الینا رسول الله ان ننسک للرؤیة فان لم نره وشهد شاهدا عدل نسکنا بشهادتهما۔ (ابو داؤد)

امیر مکہ حارث بن حاطب نے خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ رسول اللہؐ نے ہم سے عہد لیا کہ ہم حج کے ارکان چاند دیکھ کر ادا کریں۔ اگر ہم چاند نہ دیکھیں اور دو معتبر مسلمان شہادت دیں تو ان کی گواہی پر ارکان ادا کریں۔

۳- عن ربعی بن حراش عن رجل من اصحاب النبیؐ قال اختلف الناس فی آخر یوم من رمضان فقدم اعرابیان فشهدا عند النبی لاهلا الهلال امس عشیة فامر رسول الله الناس ان یفطروا وان یغدوا الی مصلاهم۔ (احمد، ابو داؤد، دارقطنی، نسائی)

ربعی بن حراش کسی صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ نبیؐ کے زمانہ میں رمضان کی انتیسویں تاریخ کو چاند نظر نہ آیا تو لوگوں نے تیسواں روزہ رکھا۔ صبح کے وقت دو بدو آئے اور انہوں نے رات کو چاند دیکھ لینے کی شہادت دی تو نبیؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنا روزہ ختم کر دیں۔

روزہ و عید دوسرے مقام کی رؤیت کی بنا پر

عن کریب ان ام الفضل بنت

حضرت کریب کا بیان ہے کہ ام الفضل بنت

الحارث بعثته إلى معاوية بالشام قال: فقدمت الشام فقضيت حاجتها واستهل علي هلال رمضان وأنا بالشام فرأيت الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني ابن عباس ثم ذكر الهلال فقال: متى رأيتم الهلال؟ فقال: رأيناه ليلة الجمعة. فقلت: رآه الناس وصاموا وصام معاوية فقال: لكن رأيناه ليلة السبت فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين يوما أو نراه فقلت: ألا تكتفي برؤية معاوية وصيامه؟ قال: لا هكذا أمرنا رسول اللہ ﷺ۔

حارث نے انھیں معاویہؓ کے پاس کسی کام سے شام بھیجا وہ کہتے ہیں کہ میں شام پہنچا اور ان کا کام پورا کیا۔ میں شام ہی میں تھا کہ رمضان کا چاند نکل آیا ہم نے جمعہ کی شب میں دیکھا، پھر مہینہ کے آخر میں میں مدینہ واپس آگیا تو عبد اللہ بن عباس نے مجھ سے چاند کے بارے میں پوچھا کہ تم لوگوں نے کب دیکھا تھا تو میں نے کہا کہ ہم نے جمعہ کی رات کو دیکھا، اور لوگوں نے بھی روزہ رکھا اور معاویہ نے بھی یہ سن کر انھوں نے کہا کہ ہم نے سنیچر کی رات کو چاند دیکھا۔ ہم روزے رکھتے رہیں گے یہاں تک کہ تیس پورے ہو جائیں یا چاند نظر آجائے۔ میں نے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک معاویہ کی رویت وصیام کافی نہیں ہے۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔

(ترمذی)

عہد صحابہ کے اس واقعہ سے اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنے والوں کی تائید ہوتی ہے مگر جو لوگ اعتبارِ اختلافِ مطالع کے قائل نہیں ہیں وہ اسے بلادِ بعیدہ پر محمول کرتے ہیں اور اپنی رائے کے حق میں ان تمام حدیثوں کو پیش کرتے ہیں جن میں رویت کا حکم عام ہے، چنانچہ اس مسئلہ میں کہ ایک جگہ کی رویت کی شہادت دوسری جگہ پورے شرعی قواعد وضوابط کے ساتھ پہنچ جائے تو کیا اس کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء کی رائیں مختلف ہو گئی ہیں اور اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اختلافِ مطالع فی الواقع موجود نہیں ہے بلکہ گفتگو اس میں ہے کہ یہ اختلافِ مطالع کے ہوتے ہوئے شرعی احکام میں اس کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں۔ کیونکہ اسلامی معاملات میں چاند، سورج اور ان کی گردش اور کیفیات کے حقائق مقصود ہی نہیں، مقصود صرف

امرِ الٰہی کا اتباع ہے اور ان گردشوں کو بطور اصطلاح ان احکام کے اوقات کی ایک علامت قرار دیا گیا ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اختلافِ مطالع شرعاً معتبر ہے لہٰذا ایک مطلع کی رویت دوسرے مطلع کے لئے کافی نہیں بلکہ ہر شہر کے لوگ اپنی رویت کا الگ اعتبار کریں گے لیکن حنفیہ کا اصل مذہب یہ ہے کہ اختلافِ مطالع معتبر نہیں ——— فی در المختار: واختلاف المطالع غير معتبر على ظاهر المذهب وعليه أكثر المشائخ وعليه الفتوى فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب كذا في فتح الملهم ج ٣ - ص١١٣ - البتہ متاخرین حنفیہ میں سے حافظ زیلعیؒ نے کنز کی شرح (تبیین الحقائق) میں لکھا ہے کہ بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع ہمارے نزدیک بھی معتبر ہے: ينبغي أن يعتبر اختلافها أن لزم منه التفاوت بين البلدتين بأكثر من يوم واحد لأن النصوص مصرحة بكون الشهر تسعة وعشرين أو ثلاثين فلا تقبل الشهادة ولا يعمل بها فيما دون أقل العدد ولا أزيد من أكثره. (فتح الملهم ج ٣ ص١١٣)

چنانچہ متاخرین احناف کے نزدیک بلادِ بعیدہ میں اعتبارِ اختلافِ مطالع ہی راجح ہے کیونکہ اگر بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا ہو سکتا ہے جس کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے:

١- الشهر ثلاثون وطبق كفيه ثلاث مرات (مسلم) فرمایا: مہینہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ پھر آپؐ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو تین بار ایک دوسرے پر رکھا۔

٢- عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ الشهر تسع وعشرون يوما. (نسائی) مہینہ ۲۹ روز کا ہوتا ہے۔

٣- عن سعد بن أبي وقاص عن النبي ﷺ أنه ضرب بيده على الأخرى وقال الشهر هكذا وهكذا ونقص في الثالثة أصبعا. (نسائی) آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر مار کر بتایا کہ مہینہ اس طرح اور اس طرح ہوتا ہے اور تیسری بار

ایک انگلی کم کردی یعنی دس + دس + ایک کم دس = ۲۹ ۔

۳۔ عن النبی ﷺ قال انا امة امية لانكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الابهام في الثالثة ثم قال الشهر هكذا وهكذا وهكذا يعني تمام الثلاثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلاثين۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ہم ایک امی قوم ہیں، نہ لکھتے ہیں نہ حساب جانتے ہیں۔ پھر آپ نے ہاتھ کی انگلیوں کے اشارہ سے ایک مرتبہ یہ سمجھایا کہ مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور دوسری دفعہ یہ سمجھایا کہ مہینہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔

ریڈیو کی خبر رؤیت

اختلاف مطالع کے بعد جو دوسرا مسئلہ پیش آتا ہے وہ یہ کہ ذرائع مواصلات سے موصول شدہ اطلاعات کا درجہ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ بنیادی بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعض کلام بحیثیت خبر تو قابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن بحیثیت شہادت قابل قبول نہیں ہوتے۔ ٹیلیگرام، ٹیلیفون، وائرلیس، ریڈیو، اخبارات اور خطوط کی خبریں خبر دینے والے کے معتبر ہونے کی صورت میں بحیثیت خبر ساری دنیا میں قبول کی جاتی ہیں اور ان پر اعتماد کرکے لاکھوں کروڑوں کے کاروبار ہوتے ہیں۔ عدالتیں بھی بحیثیت خبر ان کو تسلیم کرتی ہیں لیکن کسی معاملہ کی شہادت کے طور پر ان خبروں کو دنیا کی کوئی عدالت قبول نہیں کرتی بلکہ ضروری قرار دیتی ہے کہ گواہ مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہوکر گواہی دے۔ تاکہ اس پر جرح کی جاسکے۔ شریعت اسلامی کا حکم بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر کوئی حجت ملزمہ نہیں ہے جو دوسرے کو ماننے پر مجبور کردے جس کو خبر دینے والے کی دیانت وصداقت پر بھروسہ ہوگا وہ مان لے گا۔ اس کے برخلاف شہادت حجت ملزمہ ہے۔ جب شرعی شہادت کے ذریعہ کسی معاملہ کا ثبوت قاضی تسلیم کرلیتا ہے تو وہ اس پر مجبور ہے کہ اس کے مطابق فیصلہ دے اور فریق ثانی اس پر مجبور ہے کہ اس کو تسلیم کرے جب کہ یہ اجبار والزام صرف خبر سے نہیں ہوتا۔

آلات مواصلات سے ملی ہوئی اطلاع بہر شکل خبر کے درجہ میں ہوتی ہے۔ اسے شہادت کا درجہ کسی صورت میں نہیں ملتا۔ البتہ چاند کے عینی شاہدوں یا شہر کے قاضی کے فیصلہ کی خبر

دینے والوں کی تعداد اگر اتنی کثیر ہو جائے کہ عقلاً ان کے جھوٹ ہونے کا کوئی احتمال نہ رہے تو ایسی خبر مستفیض (مشہور) ہے۔ اس پر روزہ و عید دونوں جائز ہیں، اس میں نہ شہادت شرط ہے اور نہ شرائط شہادت ضروری ہیں۔ اس لئے اس میں ریڈیو، تار، ٹیلیفون وغیرہ ہر قسم کی خبروں سے کام لیا جاسکتا ہے۔ مگر ایک ہی ریڈیو اسٹیشن سے بہت سے شہروں کی خبریں سن لینا استفاضۂ خبر کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ جب دس پندرہ جگہوں کے ریڈیو اسٹیشن اپنے اپنے مقامات کے قاضیوں یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ نشر کریں یا جن لوگوں نے چاند دیکھا ہے ان کا بیان نشر کریں یا چار پانچ جگہوں کے ریڈیو اور دس پندرہ جگہوں کے ٹیلیفون اور خط اور ٹیلیگرام ایسے لوگوں کے پہنچیں جنہوں نے خود چاند دیکھا ہے یا اس جگہ کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ بیان کریں تو اس طرح یہ خبر خبر مستفیض ہو جاتی ہے اور اس کا اعتبار کرکے رمضان یا عید کا انعقاد کیا جاسکتا ہے۔ ••

(کتابیات: صحاح ستہ، درس ترمذی، درس مشکوٰۃ (مودودی)، فقہ السنہ)

بقیہ: رسول اکرمؐ اور یہود حجاز

لگائے گئے انتہائی ذلت آمیز الزامات کو بھی خاموشی سے پی جانا پڑا۔

مصنف نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ ایک عقیدت مند کی طرح سے کرنے کے بجائے ایک حقیقت پسند مورخ کی حیثیت سے کیا ہے کیونکہ اول الذکر صورت ہمارے جذبہ ایمانی کے لئے تو ہو سکتا ہے کہ باعث تسکین ہو لیکن اس سے اغیار کو شک اور اعتراضات کے بڑے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

یہ کتاب یہود سے متعلق متعدد نئی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنے تمام اہم دعووں کے لئے بڑے ٹھوس دلائل فراہم کئے ہیں۔ ••

دورِ جدید کے مسائل اور ان کا حل

ترجمانی: محمد اسماعیل فلاحی

فتویٰ نمبر ٣١٠ - تاریخ ١٥/١١/١٣٩٢ھ

س: ایک شخص کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی بیمار ہے اور ایسی حالت ہو گئی کہ اسے خون کی اشد ضرورت پڑی، چنانچہ اسپتال والوں نے اس کی بیوی کے لیے ان کا خون نکالا۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ چیز بیوی کے ساتھ ان کی ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہوگی؟

ج: شاید سائل نے خون کو اس دودھ پر قیاس کر لیا جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ قیاس درست نہیں ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ خون دودھ کی طرح غذا کا کام نہیں کرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نص شرعی کی رو سے جس چیز سے حرمت ثابت ہوتی ہے وہ دودھ کی رضاعت ہے اور یہ رضاعت بھی اس وقت معتبر ہوتی ہے جبکہ دو شرطیں موجود ہوں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ رضاعت کا عمل پانچ بار یا اس سے زیادہ ہوا ہو[1]۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ رضاعت ابتدائی دو سالوں کے اندر ہو۔ اسی بنیاد پر آپ کی اپنی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی پر اس خون کی وجہ سے کوئی اثر نہیں پڑتا جو آپ سے آپ کی بیوی کے لئے لیا گیا ہے۔

وباللہ التوفیق۔ وصلی اللہ علی محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

س ٣/٧ - ص ٦

س: اسلامی شریعت کی نظر میں بادشاہوں اور لیڈروں پر سوگ منانے کا کیا حکم ہے؟

ج: ہر طرح کی حمد کا مستحق اللہ ہی ہے اور درود و سلام ہو اللہ کے رسول اور آپ کے آل و اصحاب اور ان تمام لوگوں پر جنھوں نے آپ کی سنت کو اپنا کر ہدایت پائی۔

آج کل عوام کو بادشاہوں اور لیڈروں کی موت پر تین دن یا اس سے کم یا اس سے زیادہ سوگ منانے کا حکم دینا، سرکاری دفاتر بند کرنا اور جھنڈوں کو سرنگوں کرنا بہت سے اسلامی ممالک

[1] احناف کے نزدیک تھوڑی رضاعت ہو یا زیادہ، حرمت ثابت ہوگی۔

میں عام ہو گیا ہے حالانکہ اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے کہ یہ عمل شریعتِ محمدیہ کے خلاف ہے اور اس سے دشمنانِ اسلام کی مشابہت لازم آتی ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو صحیح احادیث مروی ہیں وہ سوگ منانے سے روکتی ہیں، البتہ بیوی کا معاملہ دوسرا ہے وہ چار ماہ دس دن اپنے شوہر کی وفات پر سوگ منائے گی نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عورت کے لئے خاص رخصت ہے کہ وہ اپنے عزیز کی موت پر تین دن یا اس سے کم سوگ منا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرح کا سوگ شریعت کی نگاہ میں ممنوع ہے۔ کامل اسلامی شریعت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بادشاہ، لیڈر یا ان کے علاوہ کسی دوسرے کی موت پر سوگ کو جائز قرار دیتی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کے لختِ جگر ابراہیم اور آپ کی تین بیٹیوں اور دوسرے سربرآوردہ لوگوں کی وفات ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سوگ نہیں منایا۔ آپ کی زندگی ہی میں جنگِ موتہ میں لشکرِ اسلامی کے سپہ سالار زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم مارے گئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوگ نہیں منایا۔ پھر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن صحابۂ کرامؓ نے سوگ نہیں منایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوقات میں سب سے اشرف، انبیاء میں سب سے افضل اور اولادِ آدم کے سردار تھے اور آپ کی موت پر لوگوں پر جو مصیبت ٹوٹی وہ تمام مصیبتوں میں سب سے زیادہ سنگین تھی۔ پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتقال ہوا اور صحابۂ کرامؓ نے سوگ نہیں منایا حالانکہ وہ صحابہ میں سب سے افضل اور انبیاء کے بعد مخلوقات میں سب سے اشرف تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم شہید ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ابو بکر صدیق اور انبیاء کے بعد سب سے افضل تھے لیکن صحابۂ کرامؓ نے ان کا بھی سوگ نہیں منایا۔ اسی طرح تمام صحابۂ کرام کا انتقال ہوا اور تابعین نے ان پر سوگ نہیں منایا اور ایسے ہی سعید بن مسیب، علی بن حسین زین العابدین، ان کے لڑکے محمد بن علی، عمر بن عبد العزیز اور زہری، امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی (امام ابو یوسف، امام محمد)، امام مالک بن انس، اوزاعی، ثوری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ وغیرہم جیسے عظمائے اسلام اور ائمہ علم و ہدایت تابعین و تبع تابعین کا انتقال ہوا لیکن مسلمانوں نے ان پر سوگ نہیں منایا۔ اگر سوگ منانے میں خیر کا کوئی پہلو ہوتا تو سلف صالحین

اس معاملہ میں ہم سے آگے ہوتے۔ سلف صالحین کی اتباع ہی میں ہر طرح کا خیر ہے اور ان کے طریقے کی خلاف ورزی میں ہر طرح کے شر اور فتنہ کا اندیشہ ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا سنت یہ بتاتی ہے کہ شوہروں کے علاوہ دوسروں کے لئے سوگ نہ منانے کے سلسلے میں سلف صالحین کا عمل ہی حق و صواب ہے اور آج بادشاہوں اور لیڈروں کی موت پر لوگ جو سوگ مناتے ہیں اس کی شریعت مطہرہ میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مزید برآں اس کے ساتھ دوسری بہت سی مفاسد وابستہ ہیں نیز اس سے دوسرے مصالح و مفادات مجروح ہوتے اور دشمنان اسلام سے مشابہت لازم آتی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے قائدین اور سربرآوردہ لوگوں پر واجب ہے کہ سوگ منانا چھوڑ دیں۔ صحابہ اور بعد کے سلف صالحین کے طریقہ پر چلیں نیز اہل علم پر واجب ہے کہ لوگوں کو اس پر متنبہ کریں اور انھیں اس سے باخبر کر دیں۔ اس طرح خیر خواہی کا حق ادا ہوگا اور بر و تقویٰ کے سلسلے میں باہم تعاون ہوگا اور چونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلمانوں کے امراء اور عام مسلمانوں کے لئے اپنے اندر خیر خواہی کا جذبہ رکھیں۔ اسی بنا پر یہ مختصر کلمات لکھنا میں نے مناسب سمجھا۔

اللہ عز و جل سے دعا ہے کہ مسلمان قائدین و عوام کو اپنی رضا اور شریعت کو اختیار کرنے اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کی اور مخالف شریعت چیزوں سے بچنے کی توفیق دے اور ہمارے قلوب اور ہمارے تمام اعمال کی بھی اصلاح فرمائے۔ بلاشبہ وہ دعا سننے والا اور فوراً قبول کرنے والا ہے۔ وصلى الله وسلم على نبينا محمد وآله وصحابه۔

س ۱۰۹ ۔ صـ ۱۰۱

س: جو لوگ اپنے گھروں اور اپنے اہل خانہ تک تجارت و رسائل کو پہنچنے دیتے ہیں جن میں تصویریں اور شرعی حیثیت سے حرام مضامین ہوتے ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

ج: مسلمان کے لئے ان رسالوں اور ناولوں کو اپنے گھر میں داخل کرنا جائز نہیں ہے جن میں ملحدانہ مضامین ہوں یا ایسے مضامین ہوں جو بدعت و ضلالت کی دعوت دیتے ہوں یا آوارگی اور بے حیائی کی طرف بلاتے ہوں، کیونکہ ان سے عقائد اور اخلاق دونوں ہی میں

باقی صفحہ ۲۸

تیسری اور آخری قسط

قدامت پرستی کا کیسا جنون ہے یہ؟!

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی

عہد صحابہ کے بعد اجماع کا دعویٰ ممکن نہیں

اس باب میں مزید ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا عہد صحابہ کے بعد اجماع کا دعویٰ ممکن ہے؟

اس سلسلے میں امام اصفہانی فرماتے ہیں:

عہد صحابہ ہی میں اجماع کا پتہ چل سکتا تھا، ان کے بعد اس کا پتہ چلنے کا کوئی امکان نہیں رہا (لا سبيل الى ذلك الا في عصر الصحابة واما بعدهم فلا) [1]

امام بیضاوی فرماتے ہیں:

کہا جا سکتا ہے کہ اجماع کا پتہ چلانا ممکن نہیں اس لئے کہ علماء اکناف عالم میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں بہت سے لوگ پوشیدہ رہ سکتے ہیں، کچھ گمنام ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگ محض دباؤ یا خوف کی وجہ سے جھوٹ بول سکتے ہیں اور کچھ لوگ دوسروں کے فتوے دینے سے پہلے اپنے فتووں سے رجوع بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی یہ اشکال پیدا کرے تو اس کا جواب یہ دیا جائیگا کہ صحابہ کے زمانہ میں تو اجماع کا پتہ چلانا ناممکن نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ لوگ تھوڑے تھے اور ایک محدود دائرے میں تھے۔ [2]

امام رازی فرماتے ہیں:

انصاف کی بات یہ ہے کہ آج اجماع کا پتہ چلانے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ یہ بات صرف صحابہ کے زمانے ہی میں ممکن تھی جبکہ مومنین تھوڑے تھے اور ان میں سے ایک ایک

---

[1] اصول الفقہ، ص ۲۰۳ ۔ [2] منہاج الوصول الی علم الاصول، ص ۲ ۔

وہ اجماع ظنی ہوگا۔ [۱]

کسی آیت کی بالکل نئی تاویل اور اس کا حکم

اجماع کے تعلق سے مزید ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی آیت کی بالکل ہی نئی تاویل کرے جو اس سے پہلے نہ کی گئی ہو تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس مسئلہ پر امام ابو الخطاب عقلی روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر امت نے آیت کی کوئی تاویل کی ہے تو ہمیں سوچ بچار سے کام لینا ہوگا۔ اگر انھوں نے اس تاویل کے علاوہ کسی دوسری تاویل کے غلط ہونے کی صراحت کر دی ہے تو اس سے ہٹ کر کوئی دوسری تاویل اختیار کرنی جائز نہیں ہوگی اور اگر اس طرح کی کوئی صراحت نہیں کی ہے تو وہاں سوال پیدا ہوگا کہ کیا اس آیت کی کوئی دوسری نئی تاویل کی جا سکتی ہے؟

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ تابعین نے بہت سی نئی تاویلات اختیار کی ہیں جن کا سلف کے ہاں کوئی ذکر نہیں ملتا اور اس پر کسی نے انھیں ملامت نہیں کیا۔

اس کی ایک دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ دوسری نئی تاویل اختیار کرنے سے ان کی مخالفت تو ہوتی نہیں، اس لئے کہ انھوں نے اس کے غلط ہونے کی صراحت تو کی نہیں ہے اور نہ ان کی پہلی تاویل سے دوسری تاویل کی تردید ہوتی ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ نئی تاویل اختیار کرنی جائز نہیں ہے۔ [۲]

یہاں یہ بات واضح رہے کہ علماء کی اکثریت پہلی ہی رائے کے حق میں ہے یعنی یہ کہ ممانعت نہ ہونے کی صورت میں کسی آیت کی کوئی ایسی تاویل کی جا سکتی ہے جس کا سلف کے ہاں کوئی تذکرہ نہ ملتا ہو۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: کتاب المعتمد فی اصول الفقہ، ۲/۵۱۷۔ مختصر ابن الحاجب ص ۶۳۔ الاحکام للآمدی ۱/۲۷۴؛ تیسیر التحریر ۳/۲۵۳؛ المدخل لابن بدران ص ۱۳۲)۔

مسئلہ اجماع سے متعلق یہ چند بنیادی باتیں ہیں جو بغرض سہولت سوال وجواب کی

---

[۱] مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ۱۹/۲۷۰۔ [۲] ملاحظہ ہو: التمہید ۳/۳۲۱

بارے میں تفصیل کے ساتھ معلومات فراہم کرنی ممکن نہیں۔ [۱]

امام احمد بن حنبل کا مشہور قول ہے:

من ادعی الاجماع فھو کاذب: جو اجماع کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ بعض فقہائے حنابلہ کا خیال ہے کہ یہاں امام احمد نے اجماع کا جو انکار کیا ہے اس سے مراد بھی غیر صحابہ کا اجماع ہے۔ [۲]

اجماع کی شرعی حیثیت

اس سلسلے میں مزید ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اجماع کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے امام غزالی فرماتے ہیں:

اگر پوچھا جائے: کیا آپ لوگ اجماع کی مخالفت کرنے والے کو کافر کہیں گے؟ تو ہم جواب دیں گے نہیں۔ کیونکہ اہل اسلام میں نفس اجماع کے سلسلے میں ہی بڑے اختلافات ہیں اور فقہاء جب اجماع کی مخالفت کرنے والے پر کفر کا حکم لگاتے ہیں تو اس اجماع سے مراد وہ اجماع ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی قطعی دلیل پر ہو۔ وہ دلیل قرآن کی آیت ہوگی یا حدیث متواتر۔ [۳]

امام ابن اللحام فرماتے ہیں:

اجماع ظنی کا انکار کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔

اجماع قطعی کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ قول مختار یہ ہے کہ پنج وقتہ نمازوں جیسی چیزوں کا انکار کرنے والے کی تکفیر کی جائے گی۔ [۴]

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

اجماع کے سلسلے میں لوگوں میں اختلاف ہے کہ وہ دلیل قطعی ہے یا ظنی؟ اس سلسلے میں محقق بات یہ ہے کہ جس اجماع کی بنیاد قطعی ہوگی وہ اجماع قطعی ہوگا اور جس کی بنیاد ظنی ہوگی

---

[۱] المحصول فی علم اصول الفقہ ۲/۱/۳۴-۳۵۔ [۲] اصول الفقہ۔ شیخ محمد خضری بک ص ۳۱۴۔ [۳] منقول من "تعلیقات الاصول" ص ۳۰۹۔ [۴] المختصر فی اصول الفقہ ص ۷۹۔

صورت میں یہاں پیش کر دی گئی ہیں۔ اس تفصیل کے بعد انشاء اللہ مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

اگر یہ جرم ہے تو اس جرم میں وہ تنہا نہیں

اب ہم چودھری بہادر سے پوچھتے ہیں کہ انھوں نے امام فراہی اور ان کے تلامذہ پر جو یہ الزام لگایا ہے کہ " جو اجماعِ امت کے شرعاً حجت ہونے کے منکر ہیں" تو یہاں "اجماعِ امت" سے ان کی مراد کیا ہے؟

اگر امت سے مراد ہر دور کے لوگ ہیں اور ان کے اجماع کی حجت کا انکار، تجدد اور انکارِ سنت کے ہم معنی ہے تو اس کی زد میں امام فراہی اور ان کے تلامذہ سے پہلے امام اصفہانی، امام بیضاوی، امام رازی اور ان سب سے پہلے امام احمد بن حنبلؒ اور نہ جانے کتنے لوگ آتے ہیں اور یہ سارے ہی لوگ تجدد زدہ اور منکرینِ سنت قرار پاتے ہیں۔ اور اگر امت سے مراد یہاں صحابہ کرام کی جماعت ہے تو چودھری بہادر کو یہ بتانا چاہیے کہ امام فراہی نے کس اجماعِ صحابہ کا انکار کیا ہے؟

ثانیاً: چودھری بہادر یہاں اجماع سے کون سا اجماع مراد لے رہے ہیں؟ اجماعِ ظنی یا اجماعِ قطعی؟

اگر اجماعِ ظنی مراد لے رہے ہیں تو اجماعِ ظنی کی حجیت کو امام غزالی، امام [illegible] ابن تیمیہ بلکہ ائمہ دین میں سے کسی نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے لہٰذا چودھری بہادر کو جرأتِ ایمانی سے کام لیتے ہوئے بے محابا اعلان کر دینا چاہیے کہ اس امت میں جتنے بڑے بڑے ائمہ گزرے ہیں، بدقسمتی سے وہ سب منکرینِ حدیث اور تجدد زدہ تھے۔

اور اگر اجماع سے مراد یہاں اجماعِ قطعی ہے یعنی وہ اجماع جس کی بنیاد نصِ قرآنی یا حدیثِ متواتر پر ہو، تو یہاں چودھری بہادر کو بتانا چاہیے کہ امام فراہی نے کس اجماعِ قطعی کا انکار کیا ہے؟

ثالثاً: اگر یہاں چودھری بہادر کا اشارہ اس طرف ہے کہ امام فراہی نے آیات کی تفسیر میں کہیں کہیں عام رایوں سے ہٹ کر اپنی نئی رائے پیش کی ہے تو یہاں ہم موصوف سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا امام فراہی کسی ایسی تاویل میں سلف کی رائے سے ہٹے ہیں جس تاویل کے بارے میں سلف کی یہ ممانعت موجود ہے کہ اس رائے سے ہٹنے کی گنجائش نہیں ہے؟ یا ان

رایوں میں ہٹے ہیں جن کے بارے میں اس طرح کی کوئی ممانعت ثابت نہیں ہے؟

اگر ان کا اشارہ پہلی صورت کی طرف ہے تو ہم انھیں چیلنج کرتے ہیں کہ امام فراہی کے پورے ذخیرۂ تفاسیر میں وہ کوئی ایک جگہ ایسی بتا دیں جہاں انھوں نے کوئی نئی تاویل یا نئی رائے پیش کی ہے، درآں حالیکہ وہاں سلف نے بالاجماع کوئی ایک ہی رائے یا ایک ہی تاویل اختیار کی ہے اور یہ ممانعت بھی کر دی ہے کہ یہاں اس کے علاوہ کوئی دوسری رائے یا دوسری تاویل نہیں اختیار کی جا سکتی ہے۔

اور اگر ان کا اشارہ دوسری صورت کی طرف ہے یعنی جہاں سلف سے اس طرح کی کوئی ممانعت ثابت نہیں ہے اور علماء کی اکثریت نے پوری چھوٹ دی ہے کہ دلائل کی بنیاد پر وہاں کوئی نئی رائے اختیار کی جا سکتی ہے تو ایسی صورت میں انھیں امام فراہی پر زبانِ طعن دراز کرنے سے پہلے ان تمام علماءِ امت سے اظہارِ برأت کرنی چاہیے جنھوں نے تاویل و تفسیر کے باب میں اتنی گنجائش دے کر تجدد اور انکارِ سنت کا یہ دروازہ کھول رکھا ہے۔

چوتھی دفعہ

چوتھی دفعہ جو امام فراہی اور ان کے تلامذہ پر عائد کی گئی ہے وہ یہ ہے:

" جو قرآن مجید میں مذکورہ معجزاتِ انبیاء کی اس طرح تاویل و توجیہ کرتے ہیں کہ ان کا اعجازی پہلو بالکل ختم ہو جاتا ہے اور وہ عام معمول کے طبعی واقعات یا پھر اتفاقاتِ زمانہ معلوم ہوتے ہیں۔"

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ چودھری بہادر نے یہاں بھی اسی غلط بیانی سے کام لیا ہے جس کے متعدد نمونے ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ امام فراہی معجزاتِ انبیاء کی کوئی تاویل و توجیہ نہیں کرتے اور وہ انھیں بالکل اسی طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح قرآن مجید یا صحیح احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

علامہ ندوی کی شہادت

اس کا ایک واضح ثبوت تو علامہ سید سلیمان ندوی کے عقیدت و احترام میں ڈوبے ہوئے وہ الفاظ ہیں جو انھوں نے امام فراہیؒ کے سلسلے میں "سیرت النبی" جلد سوم کے دیباچہ میں تحریر فرمائے ہیں۔ سید صاحب فرماتے ہیں:

"ان اوراق کی تالیف میں ہم اپنے ان محسنوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ان کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ مشکلات اور غوامض میں قدوۃ العلماء مولانا حمید الدین صاحب کے مشورہ نے مدد پہنچائی ہے۔"

واضح رہے کہ جلد سوم جس کے دیباچہ میں سید صاحب نے شکر و سپاس کے یہ کلمات تحریر فرمائے ہیں، وہ تمام تر معجزات انبیاء کی بحث پر مشتمل ہے۔

معلوم نہیں چودھری صاحب نے سیرت النبی کی یہ جلد دیکھی ہے یا نہیں؟ اور اگر دیکھی ہے تو وہ فرمائیں کہ یہاں معجزات انبیاء اپنے اعجازی پہلو سے عاری نظر آتے ہیں؟

پھر اس سے بھی زیادہ واضح اور روشن ثبوت خود وہ تحریریں ہیں جو معجزات کے سلسلے میں امام فراہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ قارئین کے اطمینان کے لئے ہم ان کے چند نمونے یہاں نقل کرتے ہیں:

قلم سے نکلی ہوئی تحریروں کی شہادت

استاذ امام کی ایک گراں قدر کتاب ہے "القائد الی عیون العقائد" اس میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

"لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ارشاد الٰہی ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا میں سنت اللہ سے مراد تمام مخلوق کی طبائع ہیں۔ مثال کے طور پر آگ ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان کو جلا دے۔ اس طرح انھوں نے سمجھ لیا کہ مخلوقات کی عادات تبدیل نہیں ہو سکتیں اور اسی بنیاد پر انھوں نے معجزات کا انکار کر دیا وہ ان لوگوں کے اقوال سے دھوکہ کھا گئے جنھوں نے طبائع اشیاء کو سنت اللہ کا نام دے دیا اور سب سے پہلے جن لوگوں نے اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال کیا وہ رسائل اخوان الصفا والے ہیں۔ پھر ان کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا۔ حالانکہ قرآن کی وہی تاویل صحیح ہوگی جو اس کے عام استعمالات کی روشنی میں ہو۔" (ص ۱۶۵)

(معجزہ وہ چیز ہے جو انسان کی قوت و تدبیر کے دائرے سے باہر ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ....

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معجزہ نبی کا عمل نہیں ہوتا وہ سرتاسر اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو رسول کی رسالت کی دلیل ہوتا ہے۔ قرآن سے اور صحف قدیمہ سے یہی بات سامنے آتی ہے۔

اور اگر معجزہ نبی کا فعل ہوتا تو اس سے رسالت نہیں بلکہ الوہیت ثابت ہوتی اسی لئے نبی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ واضح کر دے کہ یہ اس کی اپنی قدرت کا کرشمہ نہیں ہے؟ ....
......) (ص ۱۶۶—۱۶۷)

(جس نے یہ سمجھا غلط سمجھا کہ طبائع سنت اللہ میں سے ہیں۔ سنت اللہ جس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لئے جو وقت مقرر کیا گیا ہے بس اسی مقررہ وقت تک کیلئے وہ اپنی تاثیر دکھلائیں۔ اور اسی غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بڑی زبردست ٹھوکر کھائی چنانچہ وہ یہ کہہ گئے کہ خرق عادت محال ہے۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسی حقیقت کا انکار کر دیا جو واضح طور سے قرآن اور دوسرے صحف آسمانی سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے لئے انھوں نے واضح نصوص میں تحریف کی اور انتہائی رسوا کن غلطیوں کی دلدل میں پھنس گئے۔) (ص ۱۶۹)

(اشیاء میں یا تو فاعلی قوت ہوگی یا انفعالی۔ اگر انفعالی قوت ہے تو لازماً وہ کسی ارادے کی پابند ہوں گی اور وہ ارادہ چاہے گا تو انھیں ان کے عمل سے روکنے پر قادر ہوگا اور اگر ان میں فاعلی قوت ہے تو وہ خود ارادے کی مالک ہوں گی اور وہ چاہیں گی تو کسی چیز سے اپنے فعل کو روکنے پر قادر ہوں گی۔ ان دونوں ہی صورتوں میں خرق عادت کو ماننے میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔

لیکن ہوا یہ کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ اشیاء کے عمل میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی تو انھوں نے یہ یقین کر لیا کہ وہ ارادے سے خالی ہیں۔ اس کے بعد اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ یہ تسلیم کریں کہ وہ ایک صاحب ارادہ کے ارادے کی پابند ہیں۔ اب اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ اس صاحب ارادہ نے ان اشیاء کی خاصیتوں کو لازم قرار دے دیا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل تجربہ ہے تو ہم کہیں گے کہ تجربہ کسی کے عام طور سے وقوع پذیر ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے دوام اور لزوم کی دلیل نہیں ہو سکتا۔) (ص ۱۶۸)

(ایسا معجزہ جس میں واضح طور پر خرقِ عادت ہوا ہو) اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اس کے ماسوا تمام چیزیں بے اثر ہو چکی ہوں کیونکہ کھلے ہوئے معجزے کے بعد دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو قوم ایمان لے آئے یا عذاب کی لپیٹ میں آجائے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

ولو انزلنا ملکا لقضی الامر ثم لا ینظرون۔ "اور اگر ہم فرشتہ اتار دیں تو ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا، اور انھیں پھر مہلت نہ مل سکے گی" (ص ۱۶۳)

بریں عقل و دانش بباید گریست!

معجزات کے سلسلے میں امام فراہی کی تحریروں کے یہ چند نمونے ہیں۔ کیا کوئی بھی حقیقت پسند انسان ان تحریروں کو دیکھ کر یہ شبہ کر سکتا ہے کہ ان کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص ہے جو معجزاتِ انبیاء کا قائل نہیں یا جو ان کی ایسی تاویل و توجیہ کرتا ہے کہ ان کا اعجازی پہلو ختم ہو کر رہ جائے؟

جب صورتِ حال یہ ہے تو یہاں فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر چودھری بہادر کو کیا سوجھی تھی کہ انھوں نے امام فراہی پر ایسا جھوٹا اور بے بنیاد الزام لگایا؟ کیا یہ الزام لگانے کے لئے محض اتنی بات کافی ہے کہ امام فراہی اصحابِ فیل پر چڑیوں کی سنگ باری کے قائل نہیں؟ کیا اس واقعہ کی ساری عظمت و اہمیت چڑیوں کی سنگ باری ہی میں پوشیدہ ہے؟ یا کیا چڑیوں کی سنگ باری بیچ سے ہٹا دی جائے تو اس واقعہ کی عظمت و اہمیت میں کوئی کمی ہو جاتی ہے؟ پھر کیا قرآن پاک میں اس واقعہ کا ذکر معجزات کے پس منظر میں آیا ہے یا اس کے معجزاتی ہونے کی صراحت کی گئی ہے کہ اس کے ماننے یا نہ ماننے پر معجزات کے ماننے یا نہ ماننے کو موقوف قرار دیا جائے؟

اور اگر چودھری بہادر کی خاطر داری میں ہم ان باتوں کو تسلیم بھی کر لیں تو آخر ہواؤں کی سنگ باری اور چڑیوں کی سنگ باری میں اعجاز کے پہلو سے کیا فرق پیدا ہو جاتا ہے؟

آخر یہ کہنے کی کیا بنیاد ہے کہ چڑیوں کی سنگ باری میں تو اعجاز کا پہلو پایا جاتا ہے اور ہواؤں کی سنگ باری میں نہیں پایا جاتا؟

ہواؤں کی سنگ باری چودھری بہادر کو "اتفاقاتِ زمانہ" معلوم ہوتی ہے تو یہ بھی

کبھی ایک لمحے کے لئے نہیں معلوم ہوتی۔ پھر اتفاقاتِ زمانہ معلوم ہونے کا کیا سوال؟ کیا ایک مومن کے نزدیک "اتفاقاتِ زمانہ" نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟

"اتفاقاتِ زمانہ" کا تصور تو الحاد و دہریت کی دین ہے دین و ایمان سے اس کا کیا تعلق؟ ایک مومن کا تو یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اس کائنات کے اندر اصل حقیقت اللہ کی مشیت ہے۔ اللہ کی مشیت نہ ہو تو کوئی ایک پتہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا اور اس کی مشیت ہو جائے تو ہر ناممکن، ممکن ہو جائے۔ ایک ریگستان نخلستان اور نخلستان ریگستان میں تبدیل ہو جائے۔

اگر چڑیوں نے سنگ باری کی تو کیا؟ اور ہواؤں نے سنگ باری کی تو کیا؟ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور دونوں اس کی مشیت کی پابند ہیں۔

پھر مخلوقات میں بھی مختلف درجے ہیں اور ہوائیں اپنی قوت و سطوت اور عظمت و اہمیت کے لحاظ سے پرندوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ لہٰذا اگر کسی موقع پر اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہواؤں کا لشکر حرکت میں آجاتا ہے تو اس میں اعجاز کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا ـــــ بہ نسبت اس کے کہ پرندوں کا لشکر حرکت میں آئے۔

کیا چودھری بہادر کے "ذہنِ رسا" اور "فکرِ فلک پیما" نے ان کو یہی نکتہ سمجھایا ہے کہ امام فراہی نے واقعہ فیل کی جو تاویل کی ہے اس کا محرک بس یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے اعجازی پہلو کو ختم کرنا چاہتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو اس پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ـــ

بریں عقل و دانش بباید گریست!

پانچویں دفعہ

پانچویں دفعہ جو امام فراہی اور ان کے تلامذہ پر عائد کی گئی ہے، یہ ہے:

"جو اسلامی تعلیمات و احکام کی مسلمہ تعبیرات سے ہٹ کر ان کی ایسی تعبیریں اور تاویلیں اختیار کرتے ہیں جن کے بعد انھیں جدید عقلیت پسند ذہن کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

یہاں چودھری بہادر نے اتنی گول مول اور مبہم سی بات کہی ہے کہ اس پر مزید کوئی بات کہنی بھی مشکل ہے۔ اگر انھوں نے متعین طور سے کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہوتا تو ہم ان کی ذہنی

خلش دور کرنے اور ان کی تشفی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتے۔

البتہ ہم اس موقع پر ان کی ایک خلش کو دور کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان کی اس عبارت سے صاف نمایاں ہے۔ ان کی اس عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کے سلسلے میں ان کا ذہن صاف نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے نتیجہ میں ہر مسلم اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ جدید عقلیت پسند ذہن کے سامنے شرمندہ ہو۔

اب یہ امام فراہی اور ان کے تلامذہ کی کمزوری یا ان کی غیرت ایمانی کی کمی ہے کہ وہ یہ دقت اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ان تعلیمات و احکام کی ایسی تعبیر و تاویل کر لیتے ہیں کہ انھیں اس طبقہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

ہم نہایت وثوق کے ساتھ چودھری بہادر پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انتہائی شدید غلط فہمی کا شکار ہیں ورنہ ہمارے دین میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ہمیں کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔

اس کے برعکس اسے جس پہلو اور جس زاویے سے بھی دیکھئے اس میں جمال ہی جمال اور کمال ہی کمال نظر آئے گا۔ کوئی کٹر سے کٹر اور متعصب سے متعصب دشمن اسلام بھی اس دین میں کوئی ایسی جگہ نہیں پا سکتا جہاں وہ انگلی رکھ سکتا ہو۔ اس لئے کہ وہ سرتا سر علم و حکمت پر مبنی اور عقل و فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

اور اگر کبھی دشمنوں نے اس دین پر کوئی ایسا اعتراض کیا ہے جس پر ہمیں شرمندہ ہونا پڑا ہے تو اس شرمندگی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ خدانخواستہ اس دین ہی میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر ہمیں شرمندہ ہونا پڑے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آنجناب جیسے دین و مذہب کے ٹھیکیداروں نے دین و مذہب کی ایسی تصویر پیش کی تھی جو اس کی حقیقی تصویر نہیں تھی بلکہ خود ان کے قصور علم اور قصور فہم کی پیداوار تھی۔

پھر بدقسمتی سے یہ غلط تصویر یہ ذہنوں میں اس طرح سے رچ بس گئی ہے کہ آج اگر کوئی انھیں صحیح کرنے اور کتاب و سنت کے مطابق بنانے کے لئے اٹھتا ہے تو دوسرے بلکہ اسے مغرب زدگی اور عقلیت پسندی کا طعنہ سننا پڑتا ہے حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایسی صورت میں ہمیں اپنی کم علمی، کوتاہ فہمی، ذہنی تنگی اور دینی بے بصیرتی کا احساس ہوتا اور خوشی ہوتی کہ ہمارے درمیان کوئی ایک تو مرد حق آگاہ ایسا پیدا ہوا جو ہمیں علم کی صحیح روشنی دکھا سکتا ہو اور براہ راست کتاب و سنت کی روشنی میں شریعت کی حکمتیں سمجھا سکتا ہے جو دنیا کے سامنے اسلام کی

صحیح ترجمانی کر سکتا اور ذہنوں اور عقلوں کو اس کی عظمت و رفعت کے اعتراف پر مجبور کر سکتا ہے۔

قصہ کوتاہ اگر چودھری بہادر کا یہ احساس ہے کہ امام فراہی اور ان کے تلامذہ کو جدید عقلیت پسند حلقوں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑتا تو یہ چیز ان کے تفقہ فی الدین کی دلیل ہے نہ کہ فکری بے راہ روی کی۔ اس لئے کہ اسلام دنیا کے سامنے اپنے نام لیواؤں کو شرمندہ کرنے نہیں آیا ہے بلکہ عزت و افتخار کی بلندیوں سے ہمکنار کرنے آیا ہے۔ یہ آئین مردان حق ہے نہ کہ مذہب گوسفندان

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہ چند باتیں تھیں جو چودھری بہادر کے اس جواب باصواب کے جواب میں عرض کرنی تھیں۔ ہمیں چودھری بہادر سے تو یہ امید نہیں کہ وہ اس کی روشنی میں اپنے نقطہ نظر یا طرز فکر کی اصلاح کر لیں گے اس لئے کہ انھوں نے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ "میں یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ اور علی وجہ البصیرت کہتا ہوں۔"

ظاہر ہے جب کوئی بات شرح صدر کے ساتھ اور علی وجہ البصیرت کہی جائے تو پھر اس سے رجوع کرنا آسان نہیں ہوتا اور اگر اس "شرح صدر" اور اس "بصیرت" کے پیچھے علم و بصیرت کی کوئی ٹھوس بنیاد نہ ہو بلکہ وہ سرتا سر کم علمی اور نافہمی کی پیداوار ہو تو اس وقت تو معاملہ اور بھی زیادہ دشوار بلکہ دشوار تر ہو جاتا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر چودھری بہادر نہیں تو عام قارئین اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے اور چودھری بہادر کی "گل افشانیوں" کے نتیجہ میں ان کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہوں گی، ان وضاحتوں کے بعد انشاء اللہ وہ دور ہو جائیں گی۔

حرف آخر

آخر میں ہم ادارہ "ترجمان القرآن" کو پھر اس کی حیثیت اور اس کا مقام و منصب یاد دلانا چاہتے ہیں۔ "ترجمان القرآن" عام پرچوں کی طرح کا کوئی پرچہ نہیں ہے۔ اس کی ایک شاندار تاریخ ہے۔ اس کا ایک بلند معیار ہے۔ اور اس کا ایک پاکیزہ نصب العین ہے۔ وہ مفکر اسلام اور مفسر قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا قائم کردہ مجلہ ہے اور اس کی تاسیس کی واحد غرض ہی یہ تھی کہ وہ قرآن کا ترجمان اور قرآنی افکار کا علمبردار ہو جیسا کہ خود اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔

ایک ایسے مجلے میں ترجمان القرآن ۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ کا خاکہ اڑایا جائے ان کے لئے اہانت آمیز فقرے استعمال کئے جائیں، ان کے سلسلے میں دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے عوام میں ان کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائی جائیں، یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو ہمارے لئے انتہائی تشویشناک ہے۔

ترجمان القرآن "میں ترجمان القرآنؒ کی تضحیک!! آخر اس کے لئے کیا وجہ جواز ہے؟ کیا آج اگر مولانا مرحوم حیات ہوتے تو ترجمان میں اس قسم کے مضامین شائع ہو سکتے تھے؟ اس کا بس ایک ہی جواب ہو سکتا ہے: نہیں، ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔

پھر آج اس طرح کے گمراہ کن مضامین اس میں شائع کر کے مولانا مرحوم کی روح کو اذیت کیوں پہنچائی جا رہی ہے؟ ••

رسولِ اکرمؐ اور یہودِ حجاز

نظام الدین فلاحی ۔ سرسید ہال علی گڑھ

"مسلم مؤرخین کو یہود کے انجام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور خود یہودیوں نے اسلام سے اپنی اولین مڈبھیڑ کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھ چھوڑا ہے۔" (سید برکات احمد)

یہود حجاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن تفتیش و تحقیق کا جو حق انھیں ملنا چاہئے وہ واقعتاً نہیں مل سکا۔ اس سلسلے میں مغربی مفکرین کی جاں فشانیوں کے علاوہ سید برکات احمد صاحب نے جو گرانقدر خدمت انجام دی ہے" یقیناً قابل قدر ہے۔ سطور ذیل میں موصوف کی اسی کتاب کا تعارفی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں سرسری طور پر مغرب میں یہود حجاز اور رسول اللہؐ کے تعلقات پر کئے گئے کام کا جائزہ پیش کیا ہے۔ تقریباً بائیس مصنفین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے یا تو مستقل تحقیقی کتاب لکھی یا اپنی کتابوں میں اس موضوع کو اہمیت دی غرض کہ اس اہم تاریخی مواد کو اکٹھا کرنے میں مستشرقین نے جو خدمت انجام دی وہ مسلمانوں سے نہ ہو سکا۔

اس موضوع پر کام خاصا دشوار ہے کیونکہ،

"اس وقت ہماری دسترس میں جو مواد ہے وہ حقیقتاً ناکافی متفرق اور اکثر حالات میں باہم متضاد ہے۔"

اس موضوع پر مسلم مؤرخین کے کام نہ کرنے کے اسباب کا تجزیہ مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"غیر مسلموں کے بارے میں بعض معروف ذہنی رجحانات کو مسلم فقہاء اور مؤرخین نسلاً بعد نسل اس طرح دہراتے رہے ہیں کہ اس نے ایک متعین شکل اختیار کر لیا ہے۔"

ان تمام سوانح و مشکلات کے باوجود مصنف کو اعتماد ہے کہ:

"ان واقعات کی تنقیدی نقطۂ نظر سے دوبارہ جانچ کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی بنیاد موجود ہے۔"

مصنف نے اپنے خاص ماخذ کا تذکرہ بالترتیب یوں کیا ہے (۱) قرآن شریف (۲) ابن اسحٰق (م ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) کتاب سیرۃ رسول اللہ (۳) الجامع الصحیح للبخاری (۴) صحیح مسلم)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور یہود کی تاریخ کے اہم ذریعہ ابن اسحٰق کے کاموں کا مؤرخین نے مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا ہے لیکن مصنف کو شکوہ ہے کہ:

"کسی بھی مذہب و ملت کے محققین نے ان کے زمانے کے واقعات کا مطالعہ کرنا ضروری نہیں سمجھا حالانکہ ان واقعات نے یہود کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو یقیناً متاثر کیا ہوگا۔"

اجمالاً مصنف نے ان تمام حالات کا ذکر بھی کیا ہے جن سے یہود کے بارے میں ان کی (ابن اسحٰق) رائے کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ اس کے بعد فاضل مصنف نے ابن اسحٰق کے بارے میں یوں طعنہ زنی کی ہے:

"وہ یہود مدینہ کو مطعون کرنے کا کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔"

اس کتاب میں مصنف نے احادیث کے صرف ان حصوں سے استفادہ کیا ہے جن پر حدیثوں کی عام تنقید کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ قانونی و فقہی اموی و عباسی اثرات سے وجود میں آئی اور شیعہ و سنی اختلافات سے بحث کرنے والی احادیث کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ اسی طرح وہ احادیث جن کے رواۃ پر شبہ کیا جا سکے یا جو مطالعہ زیر بحث سے براہ راست متعلق نہیں ہیں انھیں مصنف نے الواقدی، ابن اسحٰق اور ابن سعد کی روایتوں پر ترجیح دی ہے۔

اسی طرح صحیحین کی روایت کو صرف آنحضرت کے معاصر یہودیوں سے متعلق تاریخی مواد کے سلسلے میں ترجیح دی ہے۔ مصنف نے ابو داؤد اور "وفاء الوفاء" سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن اصل تکیہ و اعتماد تسلیم شدہ ماخذ پر ہی کیا ہے۔ ماخذ کے سلسلے میں بے حد احتیاط کیا ہے حتیٰ کہ وہ ماخذ جن سے محض استفادے کا تعلق رہا ہے ان کی بھی مختصر سوانح مع ان کی روایات کی اہمیت اور مشکلات کے بیان کی ہے۔

فاضل مصنف کو اعتراف ہے کہ جہاں اصل ماخذ خاموش ملے ہیں وہاں انھوں نے نہ صرف بلاذری ابو داؤد کو بلکہ ان ماخذ کو بھی کھنگالا ہے جن کی تخلیق ایک جداگانہ مکتب کی مرہون منت ہے مثلاً یحییٰ ابن آدم کی کتاب الخراج یا ابو الفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی لیکن یہ مصنف کی تحقیقی مہارت کا کمال ہے کہ انھوں نے ان مراجع کے ضعف کی آلودگیوں سے اپنی کتاب کو پاک رکھا۔ مصنف کا یہ دعویٰ بجا ہے:

"اگر مذکورہ کتابوں کے تمام حوالے اس کتاب سے حذف کر دیے جائیں تب بھی اس تحقیقی جائزہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب اس میں ہجرت کے وقت عرب کے یہودیوں کی حالت کا سیاسی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے با تحقیق جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں یہودیوں کے اسباب زوال سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔

دوسرا باب مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے وقت وجود میں آئے ہوئے صحیفۂ نبوی کے پس منظر، مشکلات، اہمیت، تاریخ نفاذ اور اس میں درج حقوق و اختیارات کے مباحث کے ساتھ ساتھ اس وقت کی سیاسی صورت حال کا یہود کے پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب یہود اور منافقین کی مخالفتوں کا جائزہ لیا گیا ہے جس کا سرخیل ایک خاص پس منظر کی وجہ سے عبداللہ بن ابی تھا۔

چوتھا باب اس باب میں غزوۂ احزاب کا سرسری تذکرہ کرنے کے بعد مصنف نے واقعۂ بنی قریظہ کی چھان بین میں خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے ان اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے جو اس واقعہ میں نمک مرچ لگانے کا محرک ہوئے، مصنف نے بعض بڑے دلچسپ نکات اٹھائے ہیں جو اس واقعہ کو من وعن قبول کرنے سے روکتے ہیں۔ ان میں سے چند ہم نذر قارئین کرتے ہیں۔

(۱) تاریخ میں کسی ایسے معاصر یہودی مؤرخ، مصنف، مراسلہ نگار یا سیاح کا پتہ نہیں چلتا

جن کے یہاں حجازی یہود پر گرنے والی اس قیامت کا تذکرہ ملتا ہو جبکہ سولھویں صدی کے ایک یہودی مصنف سموئیل اسک (جو ایک مشتاق یہودی مصنف تھا) ایک اعلیٰ درجہ کا شہدار یہود لکھتی ہے، اپنی تحریروں کے ذریعہ رلا دینے والے اس مصنف کے یہاں بھی دیگر قبائل کی جلا وطنی کا ذکر ملتا ہے اور نہ ہی اور نہ ہی بنو قریظہ کی گردن زدنی کے بارے میں کچھ۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ گاشکر (۱۸۳۳ء) کے وقت تک کی یہودی تاریخ ان کہانیوں سے خالی ہے۔

(۲) آخر کیا وجہ تھی کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جیسے ماہر جرنیل کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ پانچ ہزار قیدیوں کو جن میں نو سو قتل کیے جانے والے تھے ان کو اتنی دور سے مدینہ لے کر آئیں؟ پھر دلچسپ بات یہ کہ مقتولین کو شہر کے بیچوں بیچ گڑھا کھود کر دفن کیا گیا۔

(۳) وہ صحابہ جنھیں قتل کرنے پر مامور کیا گیا تھا وہ پورے نو سو قتل کرنے کے باوجود نہ تھکے، نہ ہی نفسیاتی طور پر متاثر ہوئے اور نہ ہی اس اثنا کی کوئی قابل ذکر بات رہی جس کو یہ دونوں بعد میں ذکر کرتے۔

(۴) دلچسپ سوال یہ ہے کہ پانچ ہزار قیدیوں کو مسلمان کیسے گرفتار کر لائے اور انھیں مدینہ میں کس جگہ محصور رکھا اور اس اثنا میں بھی کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

پانچواں باب غزوہ خیبر کے منظر و پس منظر پر مشتمل ہے جس کے بعد یہود مدینہ کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔

چھٹا باب اختلافات کی نوعیت اور اس کے حدود کے عنوان سے جنگوں، اگر قتالیوں، محاصروں کے منطقی اسباب کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی اسباب کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ اس کے بغیر محض واقعات ہمیں کوئی فائدہ نہیں دیتے۔

اس کتاب کا مقصد تالیف مغربی مفکرین کو بعض ان اعتراضات کا مدلل جواب دینا ہے جو تحقیقی دعووں کو تنقیدی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنے نیز شہادتوں کی چھان بین کے دشوار کام سے بچنے کی وجہ سے پیدا ہوئے اور مسلمانوں کو اس کی پاداش میں اپنے آباء و اجداد پر

باقی صہ ۳۵ پر

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

الوداعی نشست

اللہ کا فضل ہے کہ یہاں طلبہ کا تعلق باہم بھی اور اپنے اساتذہ سے بھی سطحی اور رسمی قسم کا نہیں ہوتا بلکہ نہایت گہرا، مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس چمن کے ایک ایک گوشہ، اس کی ایک ایک اینٹ اور اس خاک کے ایک ایک ذرہ سے ان کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہو چکا ہوتا ہے جس کی جڑیں دل کے نہاں خانوں میں اتری ہوتی ہیں، بعد میں جس کی خوشگوار یادیں زندگی کی پرخار وادیوں اور سنگلاخ چٹانوں اور بہار زندگی کے دلآویز سبزہ زاروں میں درد کی ایک لازوال ٹیس بن کر ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔ جب وہ فراغت کی دہلیز پر کھڑے جامعہ کو الوداع کہہ رہے ہوتے ہیں تو بڑا رقت انگیز منظر ہوتا ہے، نہ اٹھتے ہوئے بوجھل اور بھاری قدم، بے چین و غمگین چہرے، درد میں ڈوبی آوازیں، آنسو بہاتی آنکھیں اور تڑپتے دل۔ لیکن پھر بھی حقیقت یہ ہوتی ہے: ع

ادا یوں کر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ
بہت دشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

اسی کا ایک منظر اس دن نظر آیا جب کہ جامعہ نے اپنے فارغ ہونے والے طلبہ کو الوداعیہ دیا۔ ۹ فروری ۱۹۸۹ء جامعہ کے تعلیمی سال کا آخری دن تھا۔ ۱۰ فروری ۸۹ء سے اسباق بند اور ۱۳ سے امتحان شروع ہونا طے تھا۔ ۹ فروری ۸۹ء کو وقفہ کے بعد اساتذہ اور فارغ ہونے والے طلبہ جامعہ کے ہال میں پہنچے اور ایک مختصر سی نشست ہوئی۔

صدر جامعہ جناب مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے اپنے عزیز طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یہ تقریب جامعہ کی طرف سے اپنے ان طلبہ کے اعزاز میں ہے جو فراغت کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ ہمارے یہ طلبہ ہمارے درمیان سات سال رہے۔ پورا نظام تعلیم و تربیت ان کی خدمت میں لگا رہا۔ ان کی فراغت سے جامعہ اور اہل جامعہ کو

خوشی ہے۔ یہ میدان عمل میں قدم رکھیں گے اور اپنے ماحول، معاشرہ اور ملک کو روشن و منور کریں گے۔ جامعہ کا مقصد تاسیس ایسے علماء تیار کرنا ہے جو کتاب و سنت پر گہری نظر کے ساتھ جدید علوم سے پوری آگاہی رکھتے ہوں تاکہ دین کی تبلیغ کا فریضہ باحسن طریق ادا ہو سکے۔ ہمیں امید ہے اور ہماری دعا بھی ہے کہ ہمارے یہ طلبہ ہماری ان توقعات پر پورے اتریں۔

صدر محترم نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا: اس موقع پر خوشی کی انتہا نہیں ہے گرچہ یہ موقع غم بھی لاتا ہے۔ وہ ہم سے مانوس تھے اور ہم ان سے مانوس۔ بہرحال اس گھڑی کا آنا تھا اور انھیں یہاں سے جانا تھا۔ وہ جہاں رہیں خوش و خرم رہیں۔ گرچہ انھیں فراغت حاصل ہو رہی ہے لیکن حصول علم سے فراغت کبھی نہیں ہوتی۔ علم اور اخلاق کی منزلیں ابھی بہت ہیں۔ کتاب و سنت کا مطالعہ، اس کے مطابق اخلاق کی تعمیر اور پھر اس علم و عمل کے ساتھ اللہ کے دین کی دعوت و تبلیغ۔ یہ ہے آپ کا فریضہ اور دنیا و آخرت میں ترقی کا ضامن۔ خدا نخواستہ اگر آپ اس حقیقت کو فراموش کر دیں تو یہ بڑی نحوس ساعت ہوگی۔ اللہ کی تائید اور نصرتیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔ وہ آپ کو علم و عمل سے نوازے اور ہم سے جو تقصیر ہوئی اسے معاف کرے۔

صدر محترم کے ان افتتاحی کلمات کے بعد بزرگ استاد مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کھڑے ہوئے اور مختصر لیکن قیمتی باتیں پیش کیں۔ مولانا نے فرمایا: طلباء عزیز سے پہلی گزارش کروں گا کہ جہاں کہیں ہوں اپنی اس ذمہ داری کو پیش نظر رکھیں جو ایک مومن کی ذمہ داری ہے یعنی اعلائے کلمۃ اللہ سے غافل نہ ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنے پیش نظر اپنا یہ مقصد رکھیں دنیا کو ہرگز نہ دیکھیں، دنیا کا جو حصہ مقدر ہے وہ مل کر رہے گا۔ آپ اپنا کام کریں، اللہ اپنا کام کرے گا۔ وہ آپ کو روزی دے گا۔ تیسری بات نماز اور تلاوت کا ضرور اہتمام رکھیں۔ آخری بات آپ نے یہ فرمائی کہ حسن اخلاق و حسن کردار وہ چیز ہے جو لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت پیدا کرے گی۔ لوگ مجبور ہوں گے کہ آپ کی بات سنیں، غور کریں اور عمل کریں۔

مولانا کی گفتگو کے بعد محترم قاضی زین العابدین صاحب اٹھے اور انھوں نے طلبہ سے کہا: آپ اس بات پر غور کریں کہ فضیلت کی ڈگری حاصل کر کے آپ نے علم کی تکمیل کر لی۔ اب علم کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ ابھی بہت کچھ پڑھنا اور سیکھنا ہے۔ آپ اپنے مطالعہ کو وسیع کریں، اپنی زندگی مطالعہ کے لئے وقف کر دیں۔ اس دنیا میں جتنے بڑے لوگ گزرے ہیں ان کی زندگیاں دیکھئے کہ کس طرح وہ آخری سانس تک مطالعہ کرتے رہے۔ یہ مطالعہ آپ کے کیریئر کو بنائے گا، مستقبل کو سنوارے گا اور دین و دنیا دونوں میں کامیاب کرے گا۔

نگران اعلیٰ مولانا رحمت اللہ اثری صاحب نے وقت کی کمی کے باعث اور دوسروں کا خیال کرتے ہوئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ہمارے طلبہ جو فارغ ہو کر جا رہے ہیں ان سے صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ وہ اپنے مرکز سے ربط رکھیں، وہ جہاں رہیں جس حال میں رہیں، مرکز سے ان کا ربط ضرور ہو۔ انجمن طلبہ قدیم کا قیام اسی مقصد کے لئے عمل میں آیا ہے۔ ہم اپنے طلبہ کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں کرتے ہیں اور ان شاء اللہ کریں گے۔ آپ جہاں رہیں اپنے مرکز اور اپنی مادر علمی کو، جہاں سے آپ نے سب کچھ حاصل کیا ہے، فراموش نہ کریں، یاد رکھیں اور اپنی جگہ رہتے ہوئے اس کی جس طرح خدمت کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں۔

اب سامعین کی نگاہیں مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب پر مرکوز تھیں۔ درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے مولانا نے فرمایا: میرے عزیز طلبہ! یہ موقع میرے لئے بڑا ہی کٹھن موقع ہے۔ ایک طرف خوشی ہے کہ قرآن و حدیث کے علوم سے مالا مال ہو کر تم اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہو، دوسری طرف رنج ہے کہ تم ہم سے دور ہو جاؤ گے۔ مولانا نے مزید فرمایا: یہ موقع کسی بھی طالب علم کی زندگی میں بڑا ہی نازک موقع ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی عقل و فہم کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے کیا فیصلہ کرتا اور کیا پروگرام بناتا ہے۔ صحیح فیصلے کی اگر توفیق ہو جائے تو پھر کیا کہنا، لیکن اگر اس موقع پر فیصلہ میں لغزش ہو جاتی ہے تو پوری زندگی کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ کتنے قیمتی افراد تھے، کتنے انمول ہیرے تھے۔ اس مرحلے میں ان سے فیصلہ کرنے میں چوک ہوئی۔ چنانچہ آج ان کی زندگیوں کو دیکھ کر عبرت اور حسرت ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو برباد کر دیا، اپنی زندگیوں کو ضائع کر دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ

ہمارے یہ عزیز طلبہ بھی اسی دردناک انجام سے دوچار ہوں۔ آپ کے سامنے ہمیشہ یہ بات رہنی چاہیے کہ آپ نے جو کچھ حاصل کیا ہے یا جو سرمایہ یہاں رہ کر اکٹھا کیا ہے وہ بڑا ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر آپ خدانخواستہ کبھی کسی آزمائش یا پریشانی سے دوچار ہوں تو ہرگز ہرگز یہ خیال دل میں نہ آئے کہ ہماری عمریں ضائع گئیں۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ادارہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ایک منفرد ادارہ ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی ادارہ کے پاس اتنا بلند تخیل نہیں ہے۔ تم نے جو اوقات یہاں گزارے ہیں یہ تمہاری خوش نصیبی کی علامت ہیں۔

بابا! تم کو اپنی زندگی کا رخ متعین کرتے وقت ہمیشہ اہم اور غیر اہم میں فرق کرنا چاہیے کبھی بھی معاشی خوشحالی یا دنیوی ترقی کو اپنا نصب العین نہیں سمجھنا چاہیے یہ ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ یہ چیز کبھی اصل مقصود نہیں بن سکتی۔ اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ تمہارے عقیدے اور فکر کا تم سے کیا مطالبہ ہے۔ اس بات سے کبھی ذہول نہ ہو کہ کیا چیز اصل اہمیت کی حامل ہے اور کیا چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ تم کو انتہائی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ یہ امت تم سے کیا امیدیں رکھتی ہے؟ اگر تم ان دونوں باتوں کو جمع کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اصل کو ترجیح دو۔ اکثر ہمیں یہ سننا پڑتا ہے کہ یہ امت قحط الرجال کا شکار ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے ہم زندہ ہیں اور ہمارے رہتے ہوئے یہ رجال کا قحط کیوں؟ قحط الرجال ایک گالی ہے یہ ایک الزام ہے، اس الزام کو دھونا اور امت کے اندر پائے جانے والے خلا کو پُر کرنا ہے۔ اگر ہم وہ رجال نہیں بنیں گے تو کون بنے گا۔ دوسروں کو نہ دیکھیے اپنی شخصیت اور صلاحیت کو پہچانیے۔ اگر آپ نے اپنی قیمتی صلاحیتوں کو دنیا کی چمک دمک کے پیچھے ضائع کر دیا تو اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہوگا۔ دنیا کا کوئی معقول انسان کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ اہم چیز کو قربان کر کے غیر اہم چیز کو حاصل کرے۔

شاباش! آپ کا یہ عزم ہو کہ آپ اول درجہ کے انسان ہوں گے، دوسرے اور تیسرے درجہ کے نہیں۔ عہد ساز شخصیات جنھیں تاریخ انسانی اپنا قیمتی سرمایہ سمجھتی ہے، انھوں نے ملت کو لوٹنے کے بجائے ہمیشہ ملت کو دیا ہے۔ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرو۔ تمہیں ایک عام قسم کا آدمی نہیں بننا ہے تمہیں عالم کی قیادت کرنی ہے، تمہیں امت کی

رہنمائی کرنی ہے اور ملت کو جو کمی محسوس ہو رہی ہے اسے پورا کرنا ہے۔ تم آج پھر سے کردار کو ابھرا ہوا دیکھنا ہے۔ امت نے مرثیہ خوانی کرتے ہوئے سالہا سال گزار دیئے۔ مرثیہ خوانی کی بساط اب لپیٹ دو۔ کمزور انسان حالات کے لحاظ سے اپنے کو بدلتا رہتا ہے لیکن مضبوط انسان حالات کے سانچے میں نہیں ڈھلتا بلکہ حالات کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ تم کو اول درجہ کا انسان بننا ہے، علمی، فکری اور اخلاقی لحاظ سے چوٹی کا انسان بننا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کا مطلوب اور پسندیدہ انسان بننا ہے۔ ایک مرد جلیل کے بارے میں آتا ہے کہ آخر عمر میں اس نے بیٹے سے پوچھا بیٹا تمہاری تمنا کیا ہے؟ تم آئندہ کیا بننا چاہتے ہو؟ بیٹے نے جواب دیا ابا جان! میں بس آپ کی طرح بننا چاہتا ہوں۔ اس مرد جلیل نے کہا میں نے بچپن میں یہ تمنا کی تھی کہ حضرت علیؓ جیسا انسان بنوں تو یہاں تک پہنچ سکا اور تم مجھ جیسا بننے کی تمنا کر رہے ہو تو کہاں تک پہنچ سکو گے؟ تم اپنے عزائم ہمیشہ بلند رکھو، اپنے سامنے ہمیشہ اونچا معیار رکھو، ہمیشہ تم اوپر کی طرف دیکھو۔ اس کے لیے تمہیں اپنے اوقات کی حفاظت کرنی ہوگی اور اسے منضبط کرنا ہوگا۔ اہم تر کام کو چھوڑ کر غیر اہم کام کرنا بھی وقت کا ضیاع ہے۔ اگرچہ وہ اچھا کام ہی کیوں نہ ہو۔ یاد رکھو جو شخصیتیں پیدا ہوئیں وہ بڑی جاں فشانیوں کے بعد اس مقام تک پہنچیں۔ ویسی شخصیتیں بن کر وہ پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ تم کو بھاری بھرکم اور مضبوط شخصیت بننا ہے۔ تمہیں ملت کی ضرورت پوری کرنی اور قحط الرجال کی گالی کو ختم کرنا ہے۔ نیک تمناؤں اور اچھی امیدوں کے ساتھ ہم تم کو رخصت کرتے ہیں۔ اور یہ امید رکھتے ہیں کہ تمہارے بارے میں آئندہ ہمیں اچھی خبریں سننے کو ملیں گی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے مستقبل کو روشن اور تابناک بنائے، تمہیں حق کا مضبوط سپاہی اور دین کا بہترین داعی بنائے اور ہم سب کو اپنی خوشنودیوں کے تحت و تاج عطا فرمائے۔

مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی سرپرست جمعیۃ الطلبہ نے فرمایا: میں سوچ رہا تھا اس سنہری اور یادگار موقع پر آپ کو کیا تحفہ دوں۔ سوچتے سوچتے ذہن میں آیا کہ کنجیوں کا یہ چھلا تحفہ میں کیوں نہ پیش کر دوں اس میں جامعہ کا مونوگرام بھی ہے اور اس کا مختصر تعارف بھی جو آپ کو جامعہ کی یاد دلاتا رہے گا۔ مجھے امید ہے آپ اپنے اس چمن کو یاد رکھیں گے۔

نگرانِ مطبخ جناب حفیظ احمد صاحب سے طلبہ کو بہت زیادہ واسطہ پڑتا ہے اسی لئے گروہ مطبخ کے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے کہا، علم و عمل لازم و ملزوم ہیں، عمل نہیں تو علم بے کار۔ میں آپ کی خدمت کرتا رہا، مجھ سے کوتاہی ہوئی ہوگی معاف کیجئے تاکہ آخرت میں میری پکڑ نہ ہو۔

ان معزز اساتذہ کے بعد فارغ ہونے والے طلبہ کی طرف سے برادر رضوان الحق صدیقی گورکھپوری اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اٹھے۔ شدت غم سے مغلوب اور آبدیدہ وہ بڑی مشکل سے رک رک کر اپنے جذبات کی ترجمانی کی کوشش کر رہے تھے جیسے کہ حلق میں آواز پھنس رہی ہو اور الفاظ خیالات کا ساتھ نہ دے پا رہے ہوں۔ انھوں نے کچھ اس طرح کے تاثر کا اظہار کیا: جناب صدر اور اساتذہ کرام! آج وہ دن ہے جو ہماری تعلیم کا آخری دن تھا آج کے بعد ہم جامعہ میں تعلیم حاصل نہیں کر پائیں گے۔ جامعہ میں ہمارا رہنا اور تعلیم حاصل کرنا شرف کی بات تھی لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اپنے مشفق اساتذہ کی کوششوں کے باوجود ہم اس مقام تک نہیں پہنچ سکے کہ اپنے کو فلاحی کہہ سکیں۔ عالمیت و فضیلت کا کورس مکمل کر لیا لیکن صحیح معنوں میں ہم نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارے اساتذہ نے پورے خلوص و محبت کے ساتھ تعلیم دی لیکن ہم نے ان کا نہ احترام کیا اور نہ تعلیم حاصل کی۔ ہمیں پورا اعتراف ہے کہ جس مرحلے میں ہم نے تعلیم حاصل کی آخر تک آپ نے تاب دے پہنچا رہے لیکن ہماری طرف سے حق ادا نہیں ہو سکا ہم نے نہ مطالعہ کا حق ادا کیا اور نہ آپ کی رہنمائیوں سے کما حقہ استفادہ کیا بعض دفعہ ہماری طرف سے گستاخیاں بھی ہوئیں ہم معذرت خواہ ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آپ دامن عفو میں جگہ دیں گے۔ اپنی پرخلوص دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت کریں گے نیز اپنے سے دور ہونے کے باوجود ہمیں برابر اپنی نصیحتوں سے نوازتے رہیں گے اور دعا کریں کہ جس مقصد کے لئے ہم یہاں آئے تھے وہ مقصد پورا ہو اور جامعہ میں ہمارا تعلیم حاصل کرنا" واقعی سود مند ہو اور ہم دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے سرفراز ہوں۔

پنکھے

موسم گرما شروع ہو چکا ہے دن بدن سورج کی تپش میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جون جولائی کے مہینے انتہائی سخت ہوتے ہیں۔ تپش کے نتیجے میں درسگاہ اور دارالاقامہ

کے کمروں میں پڑھنا اور رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پسینہ میں شرابور اور ہوا بند، عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر مسجد، مطبخ اور ہال میں کولر اور تمام کمروں میں پنکھوں کا نظم ہو جاتا تو دارالاقامہ میں بھی پڑھائی زیادہ ہوتی اور درجوں کے اسباق میں بھی اضافہ ہوتا۔ اس وقت جامعہ کو تین سو پنکھوں کی ضرورت ہے۔ چند اہل خیر حضرات نے اس سلسلہ میں پیشکش کی ہے چنانچہ جامعہ کو اب تک ساٹھ پنکھے حاصل ہو گئے ہیں مزید پیشکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور دوسروں کو مزید توفیق دے۔

بس

جامعہ کے اطراف و اکناف سے میلوں پیدل چل کر یا سائیکل اور جیپ سے طلبہ روزانہ آتے ہیں۔ طالبات کو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ جیپ میں انھیں دھکے کھانا پڑتے ہیں لیکن علم کی پیاس انھیں یہ سب برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے ان حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ جامعہ کے پاس کئی بسیں ہوں دو سیکنڈ ہینڈ بسیں چل رہی تھیں جن میں سے ایک بالکل ناکارہ ہو چکی ہے جو اب مزید چلنے کے قابل ہی نہیں رہ گئی ہے اس وجہ سے ایک بس کی فوری اشد ضرورت ہے اگر مزید ایک اور بس حاصل ہو جائے تو طالبات کو آمد و رفت میں کچھ سہولت ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہمیں بعض مخیر حضرات کی جانب سے عملاً تعاون ملا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ اور لوگ اس سلسلہ میں تعاون فرمائیں تاکہ شوال تک (نئے سال کے آغاز تک) ایک بس کی فراہمی ہو جائے۔

امتحانات

۳؍ مارچ ۱۹۸۹ء سے امتحانات بحسن و خوبی جاری ہیں جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا امتحانات ختم ہو چکے ہوں گے اور طلبہ اپنے گھروں کو پہنچ چکے ہوں گے۔ تعطیل کے بعد جامعہ ۴؍ مئی کو دوبارہ کھلے گا۔

ضلع بستی میں جامعۃ الفلاح کی شاخوں کے امتحان کی نگرانی کے لئے برادر مشتاق احمد صاحب فلاحی، مصباح العلوم چکونیاں میں موجود ہیں اور کل شام ماسٹر محمد حنیف صاحب، مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی، مولوی احسن الاثری صاحب فلاحی، مولوی امیر فیصل صاحب فلاحی اور مولوی فیاض احمد صاحب فلاحی پر مشتمل ایک وفد بستی کے لئے روانہ ہو گیا ہے۔ یہ وفد دوران امتحان اچانک وہاں پہنچے گا اور امتحانات اور ان کے نظم و نسق کا جائزہ لے گا۔

اعظم گڑھ کے دیگر ملحقہ مکاتب و مدارس کا امتحان جامعہ کے اساتذہ ایک طے شدہ

پروگرام کے تحت وہاں پہنچ رہے ہیں۔

انجمن کی شوریٰ کا اجلاس

۲۸، اور ۲۹ر مارچ کو انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی شوریٰ کا سالانہ اجلاس حسب معمول جامعہ میں ہوگا۔ اس اجلاس میں دیگر امور کے علاوہ بطور خاص سالانہ بجٹ اور جامعہ کے نظام تعلیم و تربیت کو مزید مفید اور بہتر بنانے پر غور و خوض ہوگا اور ممکنہ راہیں تلاش کی جائیں گی۔

تعمیرات

جامعۃ الفلاح کی حد بندی اور حفاظت کے پیش نظر عرصہ سے شدت کے ساتھ فصیل چہار دیواری کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ یہ کام جلد تکمیل پا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ بیشتر کام ہو چکا ہے۔ اگر اللہ کی تائید شامل حال رہی تو انشاء اللہ بقیہ کام بھی جلد ہی تکمیل پا جائے گا۔

●●

"حضرت ابو امامہ باہلیؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سو رہا تھا کہ دو شخص میرے پاس آئے۔ وہ میرا شانہ پکڑ کر ایک دشوار گذار پہاڑ کے پاس لے گئے اور اس پر چڑھنے کو کہا۔ میں نے کہا، اس پر چڑھنا میری سکت سے باہر ہے۔ انھوں نے کہا، چڑھو ہم سہارا دیتے ہیں، چنانچہ میں چڑھ گیا۔ جب پہاڑ کے بیچ میں پہنچا تو شدید قسم کی چیخیں سنیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا چیخیں سنائی دے رہی ہیں؟ انھوں نے بتایا یہ جہنم والوں کی چیخیں ہیں۔ پھر مجھے اور آگے لے جایا گیا تو دیکھا کچھ لوگ الٹے ٹانگ دیئے گئے ہیں، ان کے جبڑے پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ان سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو رمضان کے دنوں میں کھاتے پیتے تھے، روزے نہیں رکھتے تھے۔"

"سفینۂ نجات" مولانا جلیل احسن ندوی بحوالہ المنذری بحوالہ صحیح ابن خزیمہ و ابن حبانؒ

بہی خواہان جامعہ کی خدمت میں

آج کے طوفانی دور میں جب کہ ہر طرف مادیت کی یلغار ہے اور اخلاقی قدریں رو بہ زوال ہیں، اسلام پر ہر سمت سے حملے ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کو مختلف قسم کے چیلنجوں کا سامنا ہے، ایسے پر آشوب دور میں "جامعۃ الفلاح" ان چیلنجوں کا ایک پر عزم جواب ہے جہاں مسلمان بچوں اور بچیوں کی اس انداز سے تعلیم و تربیت کی جاتی ہے کہ ان کے اندر کتاب و سنت کا گہرا علم پیدا ہو اور اسلامی اخلاق و کردار سے آراستہ ہوں، عصر حاضر کے افکار و نظریات سے واقفیت ہو اور ان کے اندر احیائے دین و شہادت حق کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ وہ وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح اور دعوت اسلامی کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر سکیں۔

جامعہ ایک طویل مدت سے ملت اسلامیہ کی صحیح اور ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے اب تک سات سو سے زائد طلبہ جامعہ سے سند فراغت حاصل کرکے ہند و بیرون ہند کے مختلف گوشوں میں دین اسلام کی خدمت اور اقامت دین کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔

جامعہ کے مختلف شعبہ جات ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ میں تقریباً چار ہزار طلبہ و طالبات مصروف تعلیم ہیں۔ اساتذہ و ملازمین کی تعداد لگ بھگ ایک سو چالیس ہے، جامعہ کا مستقل ماہانہ صرفہ نوے ہزار روپئے ہے۔ یہ مصارف محض اہل خیر کے عطیوں اور امداد سے پورے ہوتے ہیں۔ سالہائے گزشتہ کی طرح امسال بھی جامعہ کے اساتذہ و وابستگان آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کسی بھی ممکن تعاون سے دریغ نہیں کریں گے۔

نیچے جامعہ کے نمائندوں اور ان کے حلقۂ کار کی فہرست دی جارہی ہے۔ براہ کرم بہی خواہان جامعہ، جامعہ کے ساتھ اپنی دلچسپیوں اور ہمدردی کا ثبوت دیں۔

گروپ نمبر

۱۔ بمبئی (۱) جناب مولوی محمد ادریس صاحب (۲) جناب ماسٹر مقصود احمد صاحب
(۳) جناب ماسٹر محمد خالد صاحب۔

۲۔ بمبئی (۱) جناب ماسٹر عبدالملک صاحب (۲) جناب ماسٹر شاہ نواز صاحب۔

۳۔ مضافات بمبئی و پونا وغیرہ (۱) جناب مولانا کمال الدین صاحب فلاحی (۲) جناب ماسٹر محمد شعیب احمد صاحب (۳) جناب ماسٹر جنید احمد صاحب۔

۴۔ بھیونڈی، کلیان، مالیگاؤں، دھلیہ، ناسک (۱) جناب مولانا عرفان احمد صاحب
(۲) جناب ماسٹر محمد حنیف صاحب۔

۵۔ دہلی، میرٹھ، غازی آباد، ہاپوڑ، دیوبند، سہارنپور، گنگوہ اور مظفر نگر۔ (۱) جناب مولانا جمیل احمد صاحب فلاحی (۲) جناب ماسٹر توفیق احمد صاحب۔

۶۔ کلکتہ، دھنباد، آسنسول، رانی گنج، جھریا (۱) جناب ماسٹر عبداللہ صاحب (۲) جناب ماسٹر بابو شاہ نواز صاحب۔

۷۔ کشمیر (۱) جناب مولانا انور محمد صاحب فلاحی (۲) جناب مولانا عبدالبر اثری صاحب فلاحی

۸۔ حیدرآباد و تلنگانہ کا پورا علاقہ (۱) جناب مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی (۲) جناب حافظ عطاء اللہ صاحب۔

۹۔ ناگپور، سیونی، چھندواڑہ (۱) جناب قاضی زین العابدین صاحب

۱۰۔ احمد آباد، بڑودہ، واپی، سورت، پاٹن، بلساڑہ وغیرہ (۱) جناب مولانا اظہار احمد صاحب فلاحی (۲) جناب مولانا عبدالکریم صاحب۔

۱۱۔ لکھنؤ، بدایوں، بلند شہر، سنبھل، مرادآباد، امروہہ، حسن پور، خورجہ، سیانہ وغیرہ
(۱) جناب مولانا فاروق عالم صاحب ندوی (۲) جناب مولانا امیر فیصل صاحب فلاحی

۱۲۔ بنارس (۱) جناب مولانا افتخار احسن صاحب ندوی (۲) جناب ماسٹر حبیب احمد صاحب

۱۳۔ جے پور، گنگاپور، سوائی مادھوپور، میرکوٹہ (۱) جناب ماسٹر محی الدین صاحب

۱۴۔ بستی، گورکھپور، گونڈہ، بہرائچ، اٹوا، بڑھنی وغیرہ (۱) جناب مولانا مشتاق احمد صاحب فلاحی (۲) جناب ماسٹر نظام الدین صاحب۔

۱۵۔ اندور اور اوجین (۱) جناب حافظ احسان الحق صاحب فلاحی۔

۱۶۔ پٹنہ، دربھنگہ، مونگیر (۱) جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فلاحی۔

۱۷۔ کانپور، نیوتنی، اناؤ وغیرہ (۱) جناب مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی
(۲) جناب ماسٹر ارشد عالم صاحب۔

۱۸۔ بھدوہی، جونپور، مرزاپور، الٰہ آباد (۱) جناب مولانا ابو بکر صاحب اصلاحی
(۲) جناب ماسٹر ہارون الرشید صاحب۔

۱۹۔ مغل سرائے، چوبک، چنار، گھوسی سلطانپور (۱) جناب ماسٹر عبدالسلام صاحب

۲۰۔ بلیا، سکندرپور، رسڑا و مضافات (۱) جناب مولانا عبدالرحمٰن خالد صاحب فلاحی

۲۱۔ علاء الدین پٹی (۱) جناب مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی۔

۲۲۔ مئو، خیرآباد، محمدآباد، کوپاگنج (۱) جناب مولانا محمد عمران صاحب فلاحی
(۲) جناب مولانا جاوید اشرف صاحب فلاحی۔

۲۳۔ کرمینی، چاند پٹی، رسولپور و مضافات (۱) جناب حافظ ارشاد احمد صاحب
(۲) جناب ماسٹر علی انور بیگ صاحب۔

۲۴۔ جین پور و مضافات۔ (۱) جناب ماسٹر مولانا عبدالباری صاحب فلاحی

۲۵۔ مبارکپور، بڑھریا گنج (۱) جناب مولانا عبدالرؤف صاحب

۲۶۔ بلریا گنج، اعظم گڑھ، سرائے میر۔ اراکین انتظامیہ اور ماسٹر کفیل احمد صاحب

(دفتر نظامت)